باپو کے قدموں میں

حصہ دوم

ناشر
انجمن ترقی اردو (ہند)
علی گڑھ ۔ ۱۹۵۳ء

انجمن
ترقیٔ اردو
ہند

قیمت پانچ روپیہ

Printed by Khaleel Sharafuddin at Q. Press, 29 Mohd. Ali Rd., Bombay 3,
and published by Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (Hind), Aligarh.
Title printed by
Aziz Husain, at National Printers' Co., Aligarh.

گیارھواں باب

احمد آباد کانگریس میں مہاتما جی کو ستیہ گرہ کے متعلق پورا اختیار دے دیا تھا اور ایسا سمجھا تھا کہ جلد کہیں نہ کہیں ستیہ گرہ شروع کر دی جائے گی۔ مہاتما جی کے دھیان میں ضلع سورت کا باردولی تعلقہ تھا۔ جس کو انہوں نے ستیہ گرہ کے لئے میدان منتخب کیا تھا۔ دوسری جگہوں کو بھی تیاری کرنے کی ھدایت کی تھی لیکن باردولی ھی کو سب سے پہلا میدان چننے کی وجہ یہ تھی۔ کہ اول تو وھاں کے رھنے والے بیدار اور جوشیلے تھے کھادی کے پرچار اور دوسری باتوں میں بھی اپنی آمادگی دکھا کر انہوں نے اپنی اھلیت ظاھر کر دی تھی۔ دوسرے اس تعلقہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو مہاتما جی کے ساتھ دکھنی افریقہ میں کام کر چکے تھے اور وھاں کی ستیہ گرہ میں

حصہ لیکر انہوں نے ستیہ گرہ کا اچھا عملی تجربہ حاصل کیا تھا کچھ دنوں کے بعد مہاتما جی اور دوسرے لوگ اس تعلقہ میں دورہ کر کے جنتا کی تیاری سے مطمئن ہو چکے تھے خیال ہوا کہ مہاتما جی باردولی میں ستیہ گرہ شروع کریں کے اس لئے تعلقہ کے بڑے لوگوں کا جلسہ وہاں ہوا میں بھی اس دن وہیں موجود تھا۔ ستیہ گرہ میں عدم تشدد پر رہ کر ہر طرح سے سرکاری زیادتی برداشت کرنے کی ہدایت دے کر ان لوگوں سے ایک آم کے درخت کے نیچے جہاں سب ہی بیٹھے تھے عہد لیا کہ وہ لوگ ستیہ گرہ میں غلط راستہ اختیار نہ کریں گے خواہ ان کو پیٹا جائے یا وہ جیل خانے بھیجے جائیں یا ان کی دھن دولت گورنمنٹ کی طرف سے ضبط کر لی جائے ان میں جو کچھ بھی خامیاں دیکھی گئی تھیں ان کو بھی دور کرنے پر زور دیا گیا تھا مہا جی نے اس بعد لارڈ ریڈنگ کو ستیہ گرہ کی اطلاع کردی انہوں نے جو خط لکھا اس میں ساری باتیں بتادی تھیں جن کی وجہ سے ستیہ گرہ کرنی لازم ہوگئی تھی —

میں عہد نامہ کے جلسے کے بعد بہار واپس آ کر صوبہ

میں دورہ کرنے لگا اس لئے کہ ستیہ گرہ شروع ہوجانے کے بعد سب ہی جگہوں پر شانتی رہنی چاہئے تھی اور ستیہ گرہ کی تیاری بھی پوری طرح ہونی چاہئے تھی۔ یہی پیغام میں جگہ جگہ پہونچا رہا تھا اچانک « سیتا مڑھی » کے علاقہ میں پپری کے ایک جلسے میں تقریر کرتے وقت مجھسے ایک تار ملا کہ باردولی میں ورکنگ کمیٹی کی بیٹھک ہونے والی ہے مجھسے فوراً وہاں پہنچنا چاہئے۔ میں وہاں سے سیدھا پٹنہ آکر « باردولی » کے لئے روانہ ہوگیا۔ جب میں باردولی اسٹیشن پر اترا تو میں نے پنڈت مدن موہن مالوی جی کو اس گاڑی سے روانہ ہوتے دیکھا۔ ان سے بہت تھوڑی باتیں ہوسکیں۔ ان سے اتنا معلوم ہوسکا تھا کہ ورکنگ کمیٹی کی نشست ختم ہوگئی اور یہ طے کر دیا گیا کہ ستیہ گرہ ملتوی کر دی جائے اس ارادے کا سبب یہ تھا کہ ضلع گورکھپور کے مقام « چوری چورا » میں ایک بلوہ ہوگیا تھا جس میں وہاں کے لوگوں نے وہاں کے پولیس تھانے کو جلا دیا تھا اور پولیس کے کئی سپاہیوں کو مار ڈالا تھا وہاں کچھ ایسا جوش پیدا ہوگیا تھا کہ لوگ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے۔

پولیس اسٹیشن پر دھاوا کر کے فساد کر دیا - اس کی اطلاع پاتے ہی مہاتما جی نے ارادہ کر لیا کہ ایسی حالت میں جبکہ جنتا نے اہنسا کو ٹھیک نہ سمجھ کر اتنا بڑا بلوہ کر دیا تو ستیہ گرہ کے لئے فضا ٹھیک نہیں ھے اسے ملتوی کرنا ھی چاھئے - اسی بات پر غور کرنے کے لئے ورکنگ کمیٹی طلب کی گئی - اس میں مہاتما جی کے فیصلے سے اتفاق کر کے ملتوی کرنے کا فیصلہ وھیں کر دیا - جب میں نے مالوی جی سے اتنا سنا تو میرے دل میں خیال ھوا کہ اس سے جو جوش ملک میں پیدا ھوا تھا اس کو ٹھیس لگے گی - میں راستہ میں یہی سوچتا ھوا مہاتما جی کے پاس پہونچا - انہوں نے دیکھتے ھی کہا کہ دیر کر کے پہنچے - اس کے بعد پوچھا "یہاں کا فیصلہ معلوم ھوا یا نہیں" میرے اس کہنے پر کہ فیصلہ کا حال سن لیا ھے انہوں نے دوسرا سوال کیا کہ "کیا فیصلے سے متفق ھو" میں اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا - میں نے صرف اتنا ھی کہا کہ لوگوں میں اس سے بے اطمینانی ھو جائے گی اس پر انہوں نے میرا خیال جاننا چاھا - میں نے کہا کہ سوچ کر جواب دوں گا - انہوں

نے اس بات کو پسند کیا۔

میں نے جب اور لوگوں سے ورکنگ کمیٹی کی پوری کارروائی تفصیل وار سن لی اس وقت اور کچھ سوچ کر اپنے دل میں میں نے فیصلہ کر لیا جو کچھ ہوا ہے وہ ٹھیک ہوا ہے اس کے بعد مہاتما جی کے پاس جا کر میں نے ان سے کہہ دیا کہ لوگوں میں بے اطمینانی تو ہوگی لیکن جو ہوا ہے وہ اچھا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ مہاتما جی کو میری رائے سے اطمینان ہوا۔ انہوں نے اپنے خیالات مجھے تفصیل سے بتائے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ستیہ گرہ کے لئے اہنسا لازم ہے۔ اس میں اگر کوئی یہ سمجھتا ہو کہ ستیہ گرہ صرف مخالف کو تنگ کرنے یا اس سے زبردستی اپنی بات منوانے ھی کے لئے کی جاتی ہے تو یہ غلط ہے۔ستیہ گرہ کا مقصد تو اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر مخالف کے دل کو جیت لینا ہے جس میں وہ ستیہ گرہ کی بات ٹھیک سمجھ کر مان لے دباؤ میں پڑ کر نہیں بلکہ اسکی سچائی اور موزونیت کو مان کر یہ جذبہ جب تک کامل طور سے لوگوں میں نہ پیدا ہوجائے اور لوگ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ کسی نہ کسی

طرح گورنمنٹ کو تنگ کرنا ھی ستیہ گرہ کا مقصد ھے اور اس تنگ کرنے میں کہیں زیادتی کرنا بھی ضروری ھو جائے وہ جائز ھے۔ اس وقت تک ستیہ گرہ نہیں چل سکتی۔ «چوری چورا» کے واقعہ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ابھی جنتا کو کوئی کیا کہے کانگریس کے کام کرنے والوں نے بھی اس مقصد کو نہیں سمجھا تھا کیونکہ کانگریس کے کام کرنے والوں ھی نے جنتا کو ابھارنے میں اور اس کے ذریعہ تھانہ جلانے اور پولس کے آدمی مروا ڈالنے میں حصہ لیا تھا۔

مہاتما جی نے کہا تھا کہ جس طرح ھانڈی کے ایک دو چاول دیکھ کر ھی یہ سمجھ لیا جاتا ھے کہ ساری ھانڈی کا چاول پک گیا ھے یا نہیں اسی طرح اس واقعہ سے سارے ملک کی حالت اور «جنتا» کے جذبات کا پتہ چل گیا۔ اگر اس صورت میں ستیہ گرہ جاری رھی تو دوسری بہت سی جگہوں میں بھی «چوری چورا» کے واقعات نظر آئیں گے۔ اور «باردولی» کی ستیہ گرہ کی بجائے بہت سے چوری چورا سامنے آجائیں گے۔ ہمیں نے بھی انہیں باتوں پر غور کر کے یہ

ارادہ کرلیا تھا اور مہاتما جی کی باتوں کو سن کر اس ارادے میں اور بھی مضبوطی پیدا ہوگئی تھی لیکن اتنا جانتا تھا کہ اس فیصلے کو بہت سے لوگ پسند نہ کریں گے۔ کیونکہ وہ اتنے ٹھنڈے دل سے غور نہیں کر پائیں گے۔ جیسا کہ بعد میں دیکھنے میں آیا ۔

« باردولی » میں میرے قیام کے وقت ھی اسی آم کے درخت کے سایہ میں پھر بڑے لوگوں کا جلسہ ھوا اس میں مہاتما جی نے ستیہ گرہ ملتوی کرنے کے اس فیصلے کو لوگوں کو سنایا اور اسکے اسباب کو سمجھایا۔ میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کے دلوں میں اس خیال اور مصلحت کے متلعق کوئی اور شبہ نہیں تھا لیکن اس فیصلے سے وہ بہت دکھی ضرور تھے اس کا سبب یہ تھا کہ وہ یہ مانتے تھے کہ ان کو ملک کے لئے کچھ کرنے کا جو موقع ملا تھا وہ خوش نصیبی ان کے ھاتھوں سے نکل گئی ۔ ملک کی آزادی اور بہبودی کے لئے وہ سارا دھن قربان کر دینے کو تیار تھے۔ اب وہ ایسا نہیں کر پائیں گے۔ اسی کی ان کو تکلیف تھی ۔ کئی آدمی تو پھوٹ کر رونے لگے۔ مہاتما جی

نے سمجھا بجھا کر ان کو شانتی دی۔

وھیں پر یہ بھی ارادہ کیا گیا کہ چند دنوں کے اندر ھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ کیا جائے جس میں باردولی کے فیصلے کو رکھا جائے۔ یہ اجلاس دلی میں ھونا طے پایا جو تاریخ مقرر کی گئی تھی اس دن پھاگن کی شیو راتری تھی کئی آدمیوں نے اس تاریخ پر ناراضگی ظاھر کی۔ تار اور چٹھیوں سے مہاتما جی کو متنبہ بھی کیا کہ اس مبارک موقع پر بہت سے ھندو روزہ رکھ کر شیو کی پوجا میں لگے رھتے ھیں اس لئے یہ اجلاس اس تاریخ پر نہ ھو بلکہ کسی دوسری تاریخ پر اسکو ھونا چاھئے۔ مہاتما جی نے اسکو نہیں مانا مجھے بھی یہ بات خود بری معلوم ھوئی۔ مہاتما جی سے میں نے کہا کہ اس سے ھندوؤں میں بے اطمینانی ھے اور وہ واجب بھی ھے۔ اس لئے ایک دو دن ٹال دینے میں کوئی حرج نہ ھوگا۔ انھوں نے میری بات نہ مان کر مجھے سمجھایا کہ ، جب کوئی ارادہ کرلیا جائے تو جہاں تک ممکن ھو اسے بدلنا نہیں چاھئے۔ جب تک کوئی اھم وجہ نہ ھو۔ لیکن یہاں کوئی ایسی وجہ دکھائی نہیں دیتی۔

کیونکہ جو روزہ رکھنا چاہتے ھیں وہ دھلی میں بھی آسانی سے رکھ سکتے ھیں. عبادت اور پوجا میں بھی کوئی دقت نہ ھوگی. کیونکہ اجلاس دن رات نہیں ھوگا. باقی وقت میں عبادت کرسکتے ھیں». انھوں نے پھر کہا «یہ تو کسی شاستر میں نہیں لکھا ھے کہ کوئی اچھا کام مبارك تاریخ کو نہیں کرنا چاھئے، خاصکر جب اس کو پبلك اھمیت ھے». میں نے دیکھا کہ مہاتماجی کس ارادہ کو کتنی اھمیت دے رھے ھیں. مجھے چمپارن کا وہ واقعہ یاد آگیا. جب وہ رات میں گٹھری اٹھا کر نئے مکان میں چل دئے تھے. کیونکہ نئے مکان میں جانے کا پہلے سے ارادہ کر لیا تھا. دوسری بات میں نے یہ دیکھی کہ ھمارے برتوں اور تیوھاروں کا کیسا اچھا مطلب نکالتے ھیں اور ھماری ان خواھشوں کو کس قدر صحیح طور سے وہ غلط سمجھتے ھیں، جو ھمکو برت کے دن ایك طرح سے بیکار اور نکما کر دیتی ھیں.

اس فیصلہ کی اشاعت ھوتے ھی چاروں طرف سے اس کے خلاف آواز اٹھنے لگی. بڑے بڑے نیتا اسوقت جیل میں تھے. دیش بندھو داس تو پہلے ھی سے ناراض تھے. جب ان کی

بات نه مان کر مہاتماجی نے لارڈ ریڈنگ کے ساتھ سمجھوته کرنے سے انکار کر دیا تھا. اب اس بات سے اور بھی ناراض ہوئے. اب ان کو ایسا معلوم ہوا که مہاتماجی نه تو سمجھوته کرتے ہیں اور نه لڑتے ہی ہیں. سارے ملک میں جوش پیدا کرکے اس کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں. پنڈت موتی لال نہرو بھی انہیں کے ہم خیال تھے. انھوں نے بھی اپنے خیالات دہلی کے اجلاس کے موقع پر لکھ بھیجے. لاله لاجپت رائے کے بھی ایسے ہی خیالات تھے. جہاں تک مجھے یاد ہے علی برادران نے بھی مہاتماجی سے اختلاف ظاہر کیا تھا. میں نے سنا تھا که جب ایک جیل سے کہیں دوسرے جیل تبادله ہوتے وقت کسی اسٹیشن پر علی برادران سے کسی کی ملاقات ہوگئی تھی. اس وقت ان لوگوں نے اسے اپنی رائے بتادی تھی. آل انڈیا کانگریس سے پہلے جو ورکنگ کمیٹی کی نشست دہلی میں ہوئی تھی اس میں سبھی باتیں کہی گئی تھیں. ان باتوں کو سن کر بھی مہاتماجی اپنی باتوں پر اٹل رہے. آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں باردولی کا تصفیه منظور کرنے کی تجویز مہاتماجی نے پیش کی. اپنے خیالات کو انھوں نے کھول کر رکھ دیا. ڈاکٹر مونجے

نے اس تجویز میں ترمیم پیش کی، جس کا منشا مہاتماجی کی ساری کارروائیوں اور سارے پروگرام کی مذمت کرنے کا تھا. اس پر بحث ہوئی. حکیم اجمل خاں اسوقت کانگریس کے صدر تھے. انھوں نے اچانك اپنی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے مہاتماجی کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور خود اٹھ کر چلے گئے. لوگوں کو خیال ہوا کہ مہاتماجی کی اپنی ہی تجویز ہے. جس کے خلاف ڈاکٹر مونجے کی ترمیم ہے، اس پر بحث ہو رہی ہے، دیکھنا ہے کہ مہاتماجی کیا کرتے ہیں. لیکن انھوں نے ایك انوکھا ڈھنگ اختیار کیا. جب کوئی تقریر کے لئے اٹھتا تو اس سے پوچھتے کہ آپ کس طرف سے بولنا چاہتے ہیں. جب وہ کہتا کہ «ہم ڈاکٹر مونجے کے خلاف بولنا چاہتے ہیں» تو کہتے آپ ذرا ٹھہر جائیے. اگر وہ کہتا کہ میں ڈاکٹر مونجے کی ترمیم کی موافقت میں بولنا چاہتا ہوں، تو اس کو اجازت دے دیتے. اس طرح سب ہی تقریریں مہاتماجی کی مخالفت میں ہونے لگیں. کچھ دیر بعد مہاتماجی کی طرف سے جو لوگ بولنا چاہتے تھے انھوں نے، یہ سمجھ کر کہ مہاتماجی ہمکو تو بولنے دینگے نہیں، کھڑے ہوکر اپنی خواہش اور مرضی

ظاہر کرنی بھی موقوف کر دی. اس سے ایسا معلوم ہونے لگا. کہ مہاتماجی کی تجویز کی موافقت میں کوئی بھی نہیں ہے. اور ان کی تجویز شاید نامنظور ہو جائے. رات کے دس بج گئے تھے. مہاتماجی کی مخالفت میں یکے بعد دیگرے لوگ بولتے ہی چلے گئے. میں بھی بیٹھے سنتا رہا. مجھے بھی یہ برا معلوم ہوا کہ اس طرح مہاتماجی اپنی موافقت کو کیوں کمزور کر رہے ہیں. جب سچ مچ وہی فریق ٹھیک ہے. جو کچھ میں نے ورکنگ کمیٹی اور اسوقت تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں سنا، اس سے میرا اپنا خیال اور بھی مضبوط ہوگیا کہ فیصلہ ٹھیک ہے آخر میں مہاتماجی نے کسی کو بھی اپنی تجویز کی موافقت میں بولنے کا موقع نہ دیکر رائے لینی شروع کر دی. یہ دیکھ کر مجھے اور بھی برا معلوم ہوا. لیکن مہاتماجی نے یا تو جلسہ کا رخ جان لیا تھا، یا سوچ لیا تھا کہ ہماری پہلی تقریر سے لوگوں نے اگر اس تجویز کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے تو اسکی موافقت میں تقریر کرا کر اس پر زور ڈالنا کہاں تک ٹھیک ہوگا اور اس سے ان کی عقل کو سمجھایا نہیں جاسکے گا. کچھ لوگوں کے یہ کہنے پر بھی کہ دوسری جانب کو کچھ کہنے کا موقع نہیں

دیا گیا ان کو خیال ظاہر کرنے کا موقع ملنا چاہئے - مہاتما جی
نے اپنا ارادہ نہیں بدلا - انہوں نے ان لوگوں سے جو ڈاکٹر
مونجے کی ترمیم کی موافقت میں تھے ہاتھ اٹھانے کے لئے کہدیا
جب ہاتھ گنے گئے تو معلوم ہوا کہ تقریباً اتنے ہی ہاتھ اٹھے
جتنی ان کی موافقت میں تقریریں ہوئیں تھیں - اس طرح ترمیم
بہت بڑی اکثریت سے نامنظور ہوگئی اور مہاتما جی کی تجویز
منظور کرلی گئی - میرا خیال ہے کہ مہاتما جی کی ترمیم اور
باردولی کے فیصلہ کی جتنی شدت سے سخت الفاظ میں نکتہ چینی
کی گئی اتنا ہی لوگ مہاتما جی کی تجویز کے موافق اور ڈاکٹر
مونجے کی ترمیم کے مخالف ہونے گئے - اسکی وجہ یہ بھی
تھی کہ ڈاکٹر مونجے اور ان کے طرفداروں نے کبھی
نان کواپریشن کے پروگرام کو پوری طرح سے منظور نہیں کیا
تھا وہ عوام کی رائے کو اسکی موافقت میں دیکھکر چپ ہوگئے
تھے لیکن جب کبھی موقع ملتا تھا تو اس پر سخت نکتہ چینی
کیا کرتے تھے - اس جلسہ میں ممبروں پر یہ اثر پڑا کہ یہ لوگ
تو ہمیشہ مہاتما جی کی مخالفت ہی کیا کرتے ہیں اس لئے یہ ایک
موقع دیکھکر کہ کچھ اور لوگ بھی ان کے مخالف ہیں - ڈاکٹر

مونجے نے کھل کر مذمت کی تجویز پیش کرنے کا طریقہ ڈھونڈھ لیا۔ اس سے جو کوئی باردولی کے فیصلہ کا مخالف بھی تھا وہ ڈاکٹر مونجے کی ترمیم کا مخالف اور مہاتما جی کی تجویز کا موافق بن گیا۔

اس کے بعد یہ ظاہر ہوگیا کہ کانگریس میں دو مکتب خیال چل رہے ہیں اور آپس میں کافی اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ گورنمنٹ اس بات سے ضرور فائدہ اٹھائے گی شاہزادے کا دورہ ختم ہوچلا تھا اسلئے اب کانگریس کے ساتھ سرکار کے سمجھوتہ کرنے کا کوئی سبب نہیں رہ گیا تھا بہت سے لوگ پہلے سے ہی جیل میں تھے اب مہاتما جی کے گرفتار کر لینے میں کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ ایسا میں نے «دلی» ہی میں ایک ایسے دوست سے سنا تھا جن کی رسائی گورنمنٹ کے لوگوں تک تھی تھوڑے ہی دنوں بعد «ینگ انڈیا» میں مہاتما جی کے دو شائع شدہ مضمونوں کی وجہ سے گورنمنٹ نے ان کو گرفتار کرلیا۔ دفعہ ۱۲٤ الف کے ماتحت سشن جج کی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اسوقت وہ گرفتار ہوکر «سابر متی» جیل میں رکھے گئے میں خبر پاتے ہی وہاں گیا۔ ایک بار تو جیل کے پھاٹک پر

دور سے ہی میں نے مہاتما جی کا درشن کیا۔ پورے درشن اور ملاقات کا موقع تو جب ہی ملا جب سشن جج کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ «نان کواپریشن» تحریک کے بعد مہاتما جی عدالت کے سامنے مجرم کی شکل میں لائے گئے۔ چمپارن میں تو ان پر مقدمہ چلا ہی تھا لیکن آج اور اس وقت کی حالت میں بہت فرق تھا۔ اسوقت گاندھی جی کو تھوڑے ہی لوگ جانتے تھے۔ لیکن اب تو وہ ملک میں اپنے دو شاہکار بھی دکھا چکے تھے۔ ایک ہندو مسلم ایکا و اتحاد کا اور دوسرے سارے ملک میں عام بیداری کا چمپارن میں جس دن انہوں نے سرکاری حکم نہ مان کر جیل کی سزا بھگتنے کا ارادہ کیا تھا اس دن ان کیساتھ ایک دو انجان آدمی تھے جو نہ تو ان کے طریق کار کو جانتے تھے اور نہ ان سے کوئی خاص واقفیت رکھتے تھے لیکن آج تو انکی آواز پر لاکھوں آدمی سارے ملک میں اپنا سارا وقت دے کر کام کر رہے تھے اور لاکھوں لوگ ان کے کہنے سے جیل خانے میں پڑے تھے جنہوں نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کو ایسا کرنا پڑے گا۔

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس دن اور آج میں بہت مطابقت بھی تھی - آج بھی مہاتما جی برٹش سامراج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے - جیسے اس روز تھے - آج بھی ان کا بھروسہ خدا اور مصیبت سہنے کی طاقت پر تھا - آج بھی عدالت کے سامنے جو بیان انہوں نے دیا - اسمیں وہی استقلال اور بھروسہ جھلک رہا تھا جو موتی ہاری کی عدالت کے بیان میں تھا --

عدالت میں سب کو آنے کی اجازت نہیں تھی لیکن ملک کے شری "کیلکر" جیسے مانے ہوئے نیتا جو جیل کے باہر رہ گئے تھے وہاں موجود تھے - چمپارن میں تو سزا نہیں ہوئی تھی لیکن احمدآباد کے جج نے چھ سال کی سزا دے دی - رخصت ہونے وقت میرے جیسے لوگ اپنے تئیں سنبھال نہ سکے اور پھوٹ کر رونے لگے وہاں سے ہم لوگ ایک طرح سے لاچار ہو کر گھر واپس آئے --

مہاتما جی نے چلتے وقت ہدایت دیدی تھی کہ ستیہ گرہ نہیں کرنا چاہئے ہمارے سامنے یہی بڑا سوال تھا کہ جو جوش لوگوں میں آچکا ہے وہ کس طرح قائم رکھا جائے - لیکن

اس کی علامتیں ظاہر میں دیکھنے لگے تھے کہ یہ بہت مشکل کام تھا۔ ہم نے تعمیری کام پر زور دے کر اس کے ذریعہ لوگوں کا جوش قائم رکھنے کی تدبیر کی۔ لیکن روز بروز وہ جوش کم ہوتا گیا۔ گورنمنٹ بھی اپنی طرف سے جہاں کچھ بھی جوش دیکھنے میں آتا تھا اسے طاقت سے دبانے میں باز نہیں آتی تھوڑے ہی دنوں میں یہ ظاہر ہوگیا کہ اب کام ڈھیلا پڑ جائے گا۔ میں احمدآباد سے لوٹ کر بہار کے ضلعوں کا دورہ کرنے لگا ہمارے سامنے کام بھی ایسا تھا کہ ہمارا سارا وقت لگ سکتا تھا احمدآباد کانگریس ہی میں ہم نے کانگریس کے اگلے اجلاس کو بہار کے لئے دعوت دے دی تھی اب پہلے یہ ارادہ کر لینا تھا کہ بہار میں کہاں پر کانگریس ہو اس کے لئے کس طرح روپیہ جمع کیا جائے اور کیا انتظام کیا جائے۔ بہار میں جوش کافی تھا۔ اس لئے اس بات کی کافی امید تھی اور پورا یقین بھی تھا کہ ہم انتظام کرلیں گے۔

بارھواں باب

ھمارے سامنے سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ کانگریس کے جو کام کرنے والے باھر تھے وہ اس پر بہت زور دے رھے تھے کہ اب ستیہ گرہ شروع کی جائے۔ گاندھی جی نے ملك میں اھنسا کی فضا نہ ھونے کی وجہ سے وائسرائے کو نوٹس دینے کے بعد بھی باردولی کی ستیہ گرہ روك دی تھی وہ جیل جانے کے وقت بھی ستیہ گرہ کرنے کی ممانعت کر گئے تھے۔ تعمیری کام میں لگ جانے کی ھدایت کر گئے تھے لیکن تعمیری کام بہت ھی خشک اور دھیما ھوتا ھے اسمیں چٹ پٹا مزہ اور جوش و خروش نہیں ھوتا اسلئے اسمیں بہت سے لوگوں کا جی نہیں لگتا۔ یہ بات اسی وقت دیکھنے میں آ گئی تھی۔ پچھلے چھبیس ستائیس سال کے تجربہ نے بھی اسکی تائید کی ھے۔ جب ستیہ گرہ نہیں کی جاسکتی تھی

اور تعمیری کام میں بہت سے لوگوں کا جی نہیں لگتا تھا تو پھر کیا کیا جائے - کہیں کہیں دھیمی آواز خاصکر مہاراشٹر میں یہ اٹھی کہ کونسل بائیکاٹ کا پروگرام اب موقوف کردینا چاہئے اب اگلے انتخاب میں شریک ہونے کے لئے کانگریس کو ابھی سے تیاری کرنی چاہئے لیکن عوام اور کانگریس کے کارکن ابھی اس بات کو سننے کیلئے تیار نہیں تھے مگر وہ بات اٹھی اور جو موافق تھے وہ کانگریس کو اس طرف کھینچنے کی فکر میں لگ گئے -

احمدآباد کانگریس میں شری وٹھل بھائی پٹیل صدر چنے گئے سب لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ "نان کوآپریشن" کو دل سے نہیں مانتے تھے - جب یہ کہا گیا کہ مہاتما جی کیساتھ ان کی کیسے نبھے گی تو مہاتما جی نے جوابدیا کہ صدر کوئی بھی ہو اس سے وہ اپنا کام نکال ہی لینگے اسلئے کسی کو اسکی فکر نہیں کرنی چاہئے وٹھل بھائی پٹیل زیادہ تر بمبئی میں رہا کرتے تھے ان کے چھوٹے بھائی ولبھ بھائی پٹیل گجرات میں رہا کرتے تھے جو گاندھی جی کے سچے مقلد اور سارے پروگرام کو پوری طرح مانتے تھے - احمدآباد استقبالیہ کمیٹی کے صدر بھی وہی تھے - اور ابھی گرفتار نہیں ہوئے تھے دکھن میں شری راجگوپال اچاریہ

اور اتر میں ڈاکٹر انصاری بھی باھر تھے —

تھوڑے ھی دنوں بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی بیٹھک ہوئی - اس میں شری وٹھل بھائی پٹیل کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو اس بات کی جانچ کرے کہ کس جگہ کے لوگ کہاں تک ستیہ گرہ کیلئے تیار ھیں اور اس کمیٹی کے اعتبار پر جہاں ھوسکے وھاں ستیہ گرہ کی جائے - شری وٹھل بھائی پٹیل بہت ھی ھوشیار تھے - ان کا مطلب یہ تھا کہ کمیٹی نے اگر یہ کہا کہ کہیں ستیہ گرہ نہیں کی جاسکتی تو پھر یہ قدرتاً کہا جاسکے گا کہ اب کونسلوں میں جانے کا پروگرام پھر جاری کیا جائے - جو لوگ کونسلوں کے مخالف تھے اور ستیہ گرہ چاھتے تھے - انہوں نے اس تجویز کو ٹھیک مانا - کیوں کہ ان کو امید تھی کہ کمیٹی کی رپورٹ پر ستیہ گرہ ہوسکے گی - لیکن ھم میں سے بہت سے لوگ کونسل کو بھی نہیں چاھتے تھے - اور مہاتما جی کی ھدایت کے مطابق ستیہ گرہ کرنی بھی نہیں چاھتے تھے - ان کے لئے بھی اس تجویز کو ماننے کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا —

خیر کمیٹی مقرر ہوگئی۔ اور سارے ملک میں دورہ کرکے ستیہ گرہ کی تیاری کے متعلق باتوں کی جانچ کرنے لگی۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ کمیٹی نے اتنا کام تو ضرور کیا کہ جہاں جہاں اس کے ممبر جاتے وہاں بیداری بھی پیدا ہو جاتی۔ اور جنتا میں جوش بڑھ جاتا۔ ساتھ ہی وہ کونسل کے متعلق بھی سوال کرتی اور اس بات کی واقفیت حاصل کرتی کہ کہاں تک کونسل کے انتخاب میں کانگریس کو کامیاب ہونے کی توقع ہے۔

«نان کو اپریشن» میں مسلمانوں نے بہت کام کیا تھا۔ کانگریس کمیٹیوں کے ساتھ ساتھ خلافت کمیٹیاں بھی ہوا کرتی تھیں۔ خلافت کمیٹی نے بھی اس بات کیلئے کمیٹی مقرر کر دی، جو کانگریس کمیٹی کے ساتھ ساتھ ہر جگہ جا کر جانچ کرتی رہی۔ آخر میں کانگریس کی جانچ کمیٹی میں بڑا اختلاف دیکھنے میں آیا۔ کمیٹی کے چھ ممبروں میں تقریباً سبھی اس بات پر متفق تھے کہ ستیہ گرہ نہیں کی جاسکتی لیکن کونسل بائیکاٹ کے متعلق تین ممبر بائیکاٹ جاری رکھنے کے موافق اور تین ممانعت اٹھا دینے کے طرفدار تھے۔ انہوں نے کانگریس کی ان تجویزوں سے

بچنے کے لئے، جن میں کونسل بائیکاٹ کی صاف تائید کی گئی تھی، یہ راستہ سمجھایا کہ بائیکاٹ وہ بھی چاھتے تھے، لیکن وہ اس بائیکاٹ کا طریقہ بدلنا چاھتے تھے. وہ انتخاب کا بائیکاٹ کرکے کونسل میں پہونچ کر کونسلوں کا بائیکاٹ کریں گے. یعنی جو لوگ کانگریس کے پروگرام کو نہیں مانتے ھیں. ان کو کونسلوں میں نہ جانے دیں. اس طرح وہ دکھا دیں کہ ملك عدم تعاون کا طرفدار ھے. جب ھم سب لوگوں کو روك نہیں سکتے ھیں اور سبھی جگہوں کے لئے امیدوار کھڑے بھی ھو جاتے ھیں. اور کوئی مخالفت نہ ھونے کی وجہ سے بلا اختلاف چن لئے جاتے ھیں، تو برٹش گورنمنٹ اچھی طرح کہہ سکتی ھے اور کہتی بھی ھے کہ کونسل بائیکاٹ کا پروگرام بالکل کامیاب نہیں ھوا. کیونکہ ایك بھی جگہ خالی نہیں ھے، اور تمام صوبوں میں وزارتیں بھی بن گئیں جو کام کر رھی ھیں. ان کا کہنا تھا کہ ھم لوگ الکشن لڑکر ایسے لوگوں کو جانے نہ دیں اور ھم متفق ھوکر کوئی وزارت بھی نہ بننے دیں، اس طرح کا نان کواپریشن بہت کارگر ھوگا، اس وقت برٹش گورنمنٹ بھی یہ نہ کہہ سکے گی کہ نئے قانون کے مطابق سبھی جگہوں میں وزارتیں کام کر رھی ھیں، اور

بائیکاٹ کی تحریک ناکام ہوگئی۔ موافقین کا کہنا تھا کہ ہم کو برٹش گورنمنٹ کی کونسلوں کا بائیکاٹ کرنا چاہئے۔ اس لئے عدالتوں، درسگاہوں اور کونسلوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ کیونکہ جنتا کو انہیں اداروں سے آئے دن کام پڑتا ھے، انہیں کے ذریعہ برٹش گورنمنٹ کا وقار بڑھتا ھے۔ ہم نے ایک بار جانا منظور کرلیا تو ان اداروں کے ساتھ ھمارا تعلق پھر سے قائم ھو جائے گا اور گورنمنٹ کی عزت جنتا کی آنکھوں میں بڑھ جائے گی، گورنمنٹ کے وہ دو عمل بھی کامیاب ھو جائیں گے جس کے ذریعہ سے ایک طرف وہ ھماری تحریک کو طاقت سے دباتی تھی اور دوسری طرف یہ دکھاتی تھی کہ اس نے جو اصلاحات دی ھیں ان سے، کچھ تھوڑے لوگوں کے سوا جو صرف تحریک کرنا ھی جانتے ھیں، سب لوگ مطمئن ھو گئے ھیں۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ نان کوآپریشن کے پروگرام سے اسیطرح ایک ایک چیز کو ھٹا کر ہم لوگ سارے پروگرام کو چھوڑ دیں گے۔ ہم یہ بھی مانتے تھے کہ کونسلوں کے اندر جا کر بائیکاٹ کا اصول نہیں چل سکے گا۔ کیونکہ قانون میں اس بات کا موقع تھا کہ کثرت رائے اگر وزارت کے خلاف ھو پھر بھی گورنمنٹ کا کام نہیں رکے گا۔ اگر گورنمنٹ مناسب

سمجھے تو کونسل کو توڑ کر نیا انتخاب کرا سکتی ھے. اگر اس نے ایسا کیا تو بار بار الکشن لڑنا ناممکن ھو جائے گا. اس طرح کمیٹی میں دو فریق ھو جانے کی وجہ سے اس مسئلہ پر اس کی اکثریت سے بھی کوئی سفارش نہیں ھوسکتی تھی.

اس بات کا تصفیہ کرنا پھر کانگریس ھی پر رہ گیا. کمیٹی کے ممبروں میں پنڈت جواھر لال نہرو جو جیل کی میعاد پوری کر کے نکل آئے تھے، شری وٹھل بھائی پٹیل اور حکیم اجمل خاں کونسل میں داخلے کے موافق تھے. شری راجگوپال اچاریہ، ڈاکٹر انصاری اور شری کستوری رنگ آئنگر کے موافق تھے. پہلے پنڈت جواھر لال نہرو کے خیالات صاف معلوم نہیں تھے. جہاں تک پتہ چل سکتا تھا وہ بائیکاٹ ھی کے طرفدار تھے، لیکن آخر میں رپورٹ لکھی جانے کے وقت وہ بڑے زوروں سے کاؤنسل میں داخلہ کے موافق ھو گئے. دیش بندھو داس بھی جیل سے نکلنے کے بعد داخلہ کے موافق ھو گئے، وہ تو جیل کے نکلنے کے پہلے بھی موافق ھی تھے. پنڈت جی کے خیالات کو مضبوط کرنے میں ان کو زیادہ سے زیادہ کامیابی ھوئی. اس طرح تینوں بڑے نیتا، جن کا مقام گاندھی جی کے بعد سمجھا جاتا

تھا، ایک طرف ہو گئے، لیکن عوام اور کانگریسی کارکن زیادہ سے زیادہ «نان کواپریشن» کے پروگرام کے بدلنے کے مخالف ہو گئے. یہ جھگڑا پہلے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے آیا لیکن اس نے ٹال کر «گیا» میں ہونیوالے کانگریس کے اجلاس کیلئے چھوڑ دیا. دیش بندھو داس احمدآباد کے صدر چنے گئے لیکن جلسے میں حاضر نہ ہوسکے تھے. حکیم اجمل خاں نے ان کی غیرموجودگی میں صدارت کا کام انجام دیا. فطرتاً لوگوں نے ان کو ھی «گیا» کانگریس کا صدر منتخب کیا. اجلاس سے پہلے ھی یہ بات ظاہر ہو گئی کہ صدر اور عام نمایندوں کے درمیان اختلاف ہوگا.

میں اس اختلافی بحث میں عدم تبدیلی کا سخت حامی سمجھا جاتا تھا. ہمارے موافق تین بڑے نیتا تھے، یعنی شری راجگوپال اچاری. سردار ولبھ بھائی پٹیل، اور ڈاکٹر انصاری. کانگریس کا انتظام ہم بہار والوں ھی کو کرنا تھا. میرا زیادہ وقت اسی میں صرف ہوتا تھا. اس کے متعلق ایک واقعہ لکھنے کے قابل ھے. جو استقبالیہ کمیٹی بنی اسکا میں ھی صدر تھا. ابھی صدارت کا انتخاب نہیں ہوا تھا. مہاتما جی نے ہم کو ایک بات

سکھادی تھی جو بہت کام کی نکلی. انھوں نے کہا تھا کہ پبلك کا کام جتنا کم سے کم خرچ میں ھوسکتا ھے اتنا ھی کرنا چاھئیے، یعنی ایك پیسه کی بھی فضول خرچی نه ھونی چاھئے. پبلك کا کام اس وقت چل سکتا ھے جب سب لوگ اسکی مدد کریں اور جو خرچ ھو وہ جنتا ادا کرے. اگر کوئی کام ایسا ھے جس کے خرچ کے لئے جنتا پیسه دینا نہیں چاھتی، تو سمجھ لینا چاھئے که جنتا اس کام کو پسند نہیں کرتی یا نہیں چاھتی. اس لئے وہ اس کے مخالف تھے که کسی پبلك ادارے کے لئے ایسا بھی کیا جائے که اس کے لئے ایك بار چندہ جمع کر کے رکھ لیا جائے. اور سود سے ھی کام چلتا رھے. ایسا کرنے سے ادارہ یقینی طور پر کمزور پڑ جائے گا اور اپنے مقصد سے الگ بھی ھوسکتا ھے. اس لئے ادارے کو اپنی افادیت اور خدمت کے ذریعه سے جنتا سے خرچ پانے کا حق دار ثابت کرتے رھنا چاھئے. جب اسکو جنتا بیکار سمجھے گی تو وہ خرچ دینا بند کر کے اس کو بیکار کر دے گی. اور محض بوجھ ھوکر نه رہ جائے گا.

اسی سلسلے میں یه بات بھی تھی که کسی پبلك خدمت کرنے والے کو کوئی ایسا کام نہیں شروع کرنا چاھئے جس کے لئے جنتا

چندہ دینے کو تیار نہ ہو اور جو پیسے کے بغیر نہ ہوسکتا ہو. ہم اکثر ہی بھول کر جاتے ہیں. اس امید میں کہ آج اگر جنتا پیسے نہ دے تو کوئی حرج نہیں. پبلک کام رکنا نہیں چاہئے. وہ بعد میں پیسے دے گی، فوراً ادھر دوسری طرح سے نہیں ہوسکتا تو قرض لے کر بھی کام چلا لینا چاہئے. یعنی پبلک کام کے لئے صرف ذاتی ذمہ داری پر، جب تک ہم اس کے لئے تیار نہ ہوں کہ جنتا اگر پیسے نہ دے تو ہم اپنے پاس سے اور اپنی جائداد بیچ کر ھی قرض ادا کر دیں گے، کسی کو قرض نہیں لینا چاہئے. کیونکہ ایسا کرنے سے آدمی جھوٹا بن سکتا ھے اور وعدہ خلافی پر بھی مجبور ھوسکتا ھے. ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ھر کسی کام کرنے والے پر جواب دھی اتنے ھی کام کی حد تک ھوتی ھے جتنے کام کے لئے جنتا اس کو خرچ کے لئے مدد کرتی ھے. اگرجنتا خرچ نہیں دیتی ھے تو اس کو بھی کام کرنے والے سے یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں کہ اس نے کیوں قرض لیکر یا اور کسی طرح سے کام نہیں پورا کیا.

مجھے مہاتما جی کی نصیحت برابر یاد رھتی ھے اور اسوقت بھی یاد تھی. بہار میں کانگریس کے پٹنہ کے اجلاس میں اس

قسم کے تلخ تجربے کو، جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ھے، بھولا نہیں ھوں. اس لئے میں نے شروع ھی میں استقبالیہ کمیٹی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ صدر کی حیثیت سے میں اپنے کو اتنے ھی خرچ کا ذمہ دار بناؤں گا جتنے روپے استقبالیہ کمیٹی کے ھاتھ میں آئیں گے. کوئی چیز اس امید سے ادھار نہ لوں گا اور نہ کوئی کام ادھار کراؤں گا کہ اگر آج پیسے نہیں ھیں تب بھی کام رکنا نہیں چاھئے، کیونکہ استقبالیہ کمیٹی کو رقم مل ھی جائے گی. نتیجۃ یہ ھوا کہ میں نہ تو کوئی ایسی چیز ادھار لینے کو اور نہ ایسے کام کو ٹھیکے پر دینے کے لئے تیار تھا جس کے لئے استقبالیہ کمیٹی کے پاس پیسے نہ آگئے ھوں. بہار میں بارش کے دنوں میں بہت زیادہ سفر بھی نہیں کیا جاسکتا ھے. برسات میں پیسے بھی نہیں مل سکتے تھے. کیونکہ اس موسم میں نہ تو کسان کے پاس پیسے ھوتے ھیں اور نہ زمیندار کے پاس. اس زمانہ میں بیوپار اور کارخانے بھی بہت ھی کم تھے. اس لئے جو کچھ تھوڑا بہت ھم جمع کرسکے تھے وہ برسات کے پہلے ھی ھوا تھا. اب ھم لوگوں کا دھیان پیسے جمع کرنے کی شدید ضرورت اتنا نہیں تھا.

برسات ختم ہوتے ہی وقت نزدیک آگیا، کیونکہ ان دنوں اجلاس دسمبر کے آخری ہفتہ میں ہوا کرتا تھا. اب اس بات کی فکر ہونے لگی کہ فوراً سب چیزوں کے لئے اگر ٹھیکے نہ دے دئے جائیں گے تو ٹھہرنے کے لئے جھونپڑے تیار نہ ہوسکیں گے اور نہ زائرین وغیرہ کے لئے، اور نہ دوسرا کوئی سامان وقت پر مہیا کرسکیں گے. اب استقبالیہ کمیٹی کے کارکنوں کا ایک جلسہ ہوا. اس میں یہ دیکھ کر. کہ میں کوئی چیز یا ٹھیکہ اس وقت تک ادھار لینا نہیں چاھتا ہوں اور نہ دینا، جب تک استقبالیہ کمیٹی کے ھاتھ میں روپے نہ آجائیں، کارکنوں کو تصفیہ کرنا پڑا کہ اس کے بڑے لوگ جب بہار بینک سے اپنی ذاتی ذمہ داری پر قرض لیں تب خرچ کیا جائے. اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کو قرض دینے والا ایک ہی ہوگا، ہم کو بہت سے لوگوں کی رقموں کے لئے تقاضے نہیں سننے پڑیں گے. بینک کو بھی اگر ادا کرنا ہوگا تو جو لوگ قرض لے رہے ھیں وھی کسی نہ کسی طرح اسکو ادا کر دیں گے. اس طرح بینک کو بھی بہت سے لوگوں پر مقدمہ چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی. اس کے ساتھ ھی

ھم نے یہ بھی تصفیہ کیا کہ سب جگھوں کے کارکن، استقبالیہ کمیٹی کے جتنے زیادہ ھوسکیں، اپنے اپنے ضلعوں میں ممبر بنائیں اور پیسے والوں سے جلسے کے لئے چندے بھی مانگیں. ابھی تک کانگریس کے کام کرنے والوں میں، حالات ٹھیک نہ سمجھنے کی وجہ سے، کچھ بے توجہی کا جذبہ پایا جاتا تھا. لیکن جب یہ تجویز شائع ھوگئی تو سب کی آنکھ کھل گئیں. اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ انھوں نے اگر جوش سے کام نہیں کیا تو سارے صوبہ کی بدنامی ھوگی اور پھر وہ ملک اور اپنے صوبے میں بھی منہ نہ دکھا سکیں گے. کیونکہ صوبے کی جنتا بھی کیسے کہہ سکے گی کہ تم نے کبھی ھم سے چندہ نہیں مانگا. اس لئے سب لوگ بہت جوش سے چندہ جمع کرنے میں مصروف ھوگئے اور بہت جلد رقم جمع بھی ھونے لگی.

گورنمنٹ کے نیچے درجہ کے حاکم کچھ سوچنے لگ گئے تھے کہ گاندھی جی کے جیل جانے کے بعد ایسی حالت ھوگئی ھے کہ اجلاس کے لئے بھی چندہ جمع نہیں ھوسکتا اور قرض لینے کی نوبت آ گئی ھے. لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ھے سب لوگ چندہ جمع کرنے کے کام میں مصروف

ھوگئے۔ میں بھی اس کام کے لئے دورہ کرنے لگا. بنك سے بھی بات چیت ھوگئی اور وہ رقم دینے پر بھی راضی ھوگیا، لیکن ابھی رقم لی نہیں گئی تھی. میں چار پانچ دن کے سفر کے بعد کئی ہزار کی معقول رقم لیکر «گیا» لوٹا. دن کے تین چار بجے کا وقت تھا. پولیس کے لوگ اس بات کی فکر میں تھے کہ دیکھیں اب کانگریس ھوتی بھی ھے یا نہیں، ان لوگوں کو قرض ملتا بھی ھے یا نہیں. میں جب اسٹیشن پر اترا تو میں نے پہلے ھی سوچ لیا تھا کہ جو روپیہ میں لایا ھوں اسکو پہلے بنك میں جمع کر دوں گا. کیونکہ کانگریس کے جلسہ کی جگہ شہر سے کچھ دور پر تھی. وھیں پر ایك باغیچہ میں ایك چھوٹے سے مکان میں استقبالیہ کمیٹی کا دفتر تھا جہاں روپے رکھنے میں خطرہ تھا. اس لئے میں جیسے ھی اتر کر گاڑی میں روانہ ھو رھا تھا کہ پولیس کا داروغہ میرے پاس آیا، اور پوچھا کہ قرض لینے کا جو خیال تھا اس میں آپ کہاں تك کامیاب ھوئے اور کانگریس کا کام کیسے چلے گا. میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس کے دل کی بات تو یہ تھی کہ ھم لوگ مشکل میں پھنس گئے ھیں، اور اب شاید «گیا» میں کانگریس

نہ ہوگی. میں نے اسکو صاف صاف جواب دے دیا کہ ہم کو قرض لینے کی ضرورت نہیں. یہ سن کر اسکو بڑا تعجب ہوا. میں نے اسکو بتا دیا کہ روپے جمع ہونے لگے ہیں، میں خود ایك معقول رقم چار پانچ دن میں جمع کرکے ساتھ لایا ہوں. اس بات کا اسکو یقین نہیں ہوا. وہ سمجھا کہ میں اسکو چکمہ دیرھا ہوں. اسوقت میں سیدھا بنك گیا. وہ بھی میری گاڑی کے ساتھ ساتھ سائیکل پر گیا. جب میں نے روپے جمع کر دئے اور استقبالیہ کمیٹی کے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا، جہاں میں ٹھہرا کرتا تھا، تو اس کو میری بات کا یقین ہوا. دفتر پہونچنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ روپے کے متعلق جو کامیاب تدبیریں ہو رہی تھیں ان کی خبر کئی ضلعوں سے آگئی ہے. اب بے فکر ہوکر میں انتظام کے کام میں لگ گیا. کل سامان خریدا جائے گا، جھونپڑے وغیرہ بھی تیزی سے بننے لگے.

اس طرح مہاتماجی کی نصیحت کو، جسے بہت سے لوگ ٹھیك سمجھ نہیں سکے تھے، ہم نے تجربہ سے ٹھیك پایا. اب تك اسی کے مطابق چل کر میں اپنے تئیں بہت سی مشکلات سے بچا سکا ہوں.

«گیا» کانگریس میں داخلہ کونسل کے سوال پر بہت بحث ہوئی. کانگریس کئی دنوں تک ہوتی رہی. آخر میں رائے لینے پر معلوم ہوا کہ تقریباً دو تہائی نمایندے داخلہ کونسل کے مخالف ہیں اور ایک تہائی موافق. اس طرح زبردست اکثریت سے داخلہ کی ممانعت «گیا» کانگریس نے بھی قائم رکھی. لیکن جھگڑا یہیں پر ختم نہیں ہوا. دیش بندھو داس نے استعفاء دے دیا کیونکہ اکثریت ان کے خلاف تھی. زیادہ اصرار کے باوجود بھی وہ صدر رہنے پر تیار نہیں ہوئے. پنڈت نہرو کے ساتھ مل کر انھوں نے سوراج پارٹی قائم کی اور یہ اعلان کیا کہ وہ پارٹی کانگریس کو اپنی طرف لانے کی تدبیر اور داخلۂ کونسل کی تیاری کرے گی. میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا صدر چنا گیا. شری راج گوپال اچاری کے ساتھ میں نے کئی صوبوں کا دورہ کیا. یہ آپس کا جھگڑا کسی نہ کسی طرح چلتا رہا. اس عرصہ میں ناگپور میں ستیہ گرہ شروع ہوگئی. سی پی گورنمنٹ نے پہلے جبلپور اور اس کے بعد ناگپور میں قومی جھنڈے کے ساتھ جلوس نکالنے پر پابندی لگادی. اس لئے ناگپور میں سیٹھ جمنا لال بزاز نے ستیہ گرہ جاری

کردی جو مہینوں تك چلتی رهی. اس میں دور دور سے رضا کار آ کر حصه لیتے رهے. بہار کے رضا کاروں کے ساتھ میں بھی کئی بار نا گپور آیا گیا. لیکن میں خود ستیه گره میں شریك نہیں هوا. سیٹھ جی کی گرفتاری کے بعد شری ولبھ بھائی پٹیل نا گپور میں رہ کر ستیه گره کی رهنمائی کرنے لگے. اس کے بعد شری وٹھل بھائی پٹیل بھی ان کی مدد کو آ گئے. آخر میں گورنمنٹ نے جھنڈے کا جلوس ان راستوں سے بغیر روك ٹوك جانے دیا جن سے پہلے نہیں گذرنے پایا تھا. اس طرح ستیه گره ختم هوگئی. جو لوگ جیل خانوں میں تھے تھوڑے هی دنوں کے اندر سب چھوڑ دئے گئے.

کونسل کے متعلق اختلاف اتنا بڑھ گیا تھا که اب کانگریس کا اجلاس بغیر اس کے فیصلے کے ممکن نہیں تھا. نومبر سنه ۱۹۲۳ع میں نیا انتخاب هونے والا تھا. چونکه اس کا فیصله اس کے پہلے هی هونا تھا. اسلئے کانگریس کا خاص اجلاس کرنے کا فیصله هوا. وہ مولانا ابوالکلام کی صدارت میں دهلی میں هوا. مولانا حال هی میں دلی جیل سے نکلے تھے. کونسل کے داخلے کےموافق تھے. اجلاس کے پہلے هی مولانامحمدعلی بھی

جیل سے نکلے. اور سیدھے اجلاس میں پہونچے. کونسل میں داخلے کے مخالف تھے. ان کی رائے سے ایک سمجھوتہ ہوا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ کانگریس کی طرف سے "الکشن" نہ لڑا جائے. لیکن اگر کوئی کانگریسی کونسل میں جانا چاھے تو اس کو اس بات کی اجازت ھے. اس طرح سوراج پارٹی کو اپنے بل بوتے پر الکشن لڑنے کا موقع ملا. اس کی طرف سے بہت سے کانگریسی لوگ الکشن کے لئے کھڑے ہو گئے. صرف سی پی میں سوراج پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی. بنگال میں اکثریت تو نہیں لیکن اچھی تعداد میں جگہ مل گئی. مگر دوسرے صوبوں میں کچھ ایسے سوراجی چنے گئے جو نہ تو وزارت بنا سکتے تھے اور نہ دوسروں کو وزارت بنانے سے روک سکتے تھے. سی پی میں وزارت نہ بنی. بنگال میں کچھ دنوں کے بعد دوسرے لوگ الگ ہو کر سوراجیوں کے ساتھ مل گئے. وھاں کی وزارت بھی ٹوٹ گئی. کوکناڈا میں کانگریس کا اجلاس مولانا محمد علی کی صدارت میں ہوا، اس میں بھی کونسل کے داخلے کی ممانعت قائم رکھی گئی.

تیرھواں باب

جب سے یہ کونسل کا جھگڑا چھڑا اور مہاتماجی نے سنہ ۱۹۲٤ع میں جیل سے نکلنے کے بعد اس کو طے نہیں کرلیا اس وقت تک اس سوال پر سارے ملك میں بحث مباحثہ ھی ھوتا رھا. دوسرا کوئی کام بھی تیزی سے کیساتھ پورے جوش سے نہ ھوسکا. مہاتماجی نے تعمیری کام پر زور دیا تھا. ھم لوگوں سے جہاں تک بن پڑا اس میں زور لگایا. کھادی کے کام کو منظم کرنے کیلئے کوکناڈا کانگریس میں کھادی بورڈ قائم کیا. سیٹھ جمنا لال بزاز کی لیڈری ی میں یہ کام منظم صورت سے چلنے لگا. میرا بھی بہت وقت کھادی پرچار اور قومی تعلیم ھی میں صرف ھوتا رھا. کھادی میں روز بروز ترقی ھوتی گئی لیکن قومی تعلیم کا کام گرتا گیا. اس طرح دوسری طرف کونسل میں داخلے کے طرفداروں کا زور بڑھتا گیا. جتنے لوگ جیل سے نکلے ان میں بہت سے لوگ سوراج پارٹی کے پروگرام کو ھی زیادہ پسند کرتے. قومی تعلیم میں ھم لوگوں نے شروع ھی سے زبردست غلطی کی تھی، وھی اس کے ناکام ھونے کا سبب ھوئی. ھم نے

زیادہ سے زیادہ سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں کی نقل کی تھی۔
لیکن ہمارے پاس نہ اتنے ذرائع تھے نہ اتنی رقم تھی کہ ان کا مقابلہ
کرسکتے۔ ساتھ ھی قومی اسکولوں کے تعلیم پائے ہوئے طالبعلموں
کو سرکاری یا غیر سرکاری نوکریاں پانے کی وہ آسانی بھی نہیں تھی
جو سرکاری اسکولوں کے طالب علموں کو حاصل تھی۔ ہاں ہم
نے ایک دو باتوں میں کچھ اپنی خصوصیت رکھی تھی، جیسے
سبھی قومی اداروں کے طالب علموں کیلئے چرخہ چلانا لازمی
تھا۔ اس کے علاوہ رہن سہن میں بھی دوسرے طالب علموں
کے مقابلہ میں بہت فرق تھا۔ کیونکہ وہ سادگی اور مہاتما جی
کی سچائی اور اہنسا کی فضا میں رہتے تھے۔ اس لئے ان کی
زندگی سادہ اور کردار روشن ہوا کرتا تھا۔ کچھ طالب علم ایسے
بھی تھے جنہوں نے گورنمنٹ کی یونیورسٹیوں کے مقابلہ کی
قابلیت پیدا کرلی تھی۔ لیکن ایسے طالب علموں کیلئے کوئی ایسا
میدان عمل نہیں ملا جہاں وہ روزی بھی کما سکیں اور ملک کا
کام بھی کرسکیں۔ اس لئے اب صرف ایسے ھی طالب علم آنے
لگے جو پہلے ھی سے ملک کی خدمت اپنا مقصد بنا چکے تھے یا
والدین ان کو ایسے کام میں لگانا چاہتے تھے۔ طالب علموں کی

تعداد گھٹتی گئی. ہم نے طریق تعلیم میں کبھی کبھی تبدیلیاں بھی کیں. سرکاری یونیورسٹی کی پیروی چھوڑ کر، جیسا گاندھی جی نے شروع میں کہا تھا، ہم نے ملك کے خادم تیار کرنے کی طرف زیادہ دھیان اپنے طریقه میں دیا. لیکن یه کافی نہیں ہوا. روز بروز قومی تعلیم گاھیں گرتی ھی گئیں یہاں تك که بہت سی بند بھی ہوگئیں، اور جو چلتی رھیں وہ ادھه مری ہوکر. یه ظاہر ہوگیا که قومی درسگاہوں کو صرف خادم تیار کرنے کے کام میں لگ جانا چاهئے. ظاہر ھے که اس طرح طالب علم جو ملك کی ھی خدمت کو اپنا مقصد بنالیں کم تعداد میں ملیں گے. اس طرح طالب علموں کی تعداد روز بروز کم ہوتی گئی.

ھاں کھادی کا کام بڑھتا گیا. سوراج پارٹی نے بھی کھادی کو اپنایا. کیونکه دوسری جماعت والوں سے ان کو مقابله کرنا تھا. کھادی ھی ایك ایسی چیز تھی جو ان کو دوسری چیزوں سے ممتاز کرسکتی. اس وقت کھادی مہین اور اچھی بنانے کی کوشش کی گئی. بکری بھی بڑھائی گئی. بکری اور پرچار کے خیال سے کہیں کہیں کھادی کی نمائش بھی کی جاتی تھی. جس میں بہتر

سے بہتر کھادی رکھی جاتی تھی. ایسے لوگ بھی جو کانگریس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے. اس نمائش میں آتے اور کھادی خریدتے. میں ان نمایشوں میں خاصکر بہار میں بہت حصہ لیتا. اور اپنے ھاتھوں بہت کھادی بیچا کرتا. پیداوار کے مرکزوں میں بھی بہت جایا کرتا. وھاں ایسے ایسے منظر دیکھنے میں آتے جن سے کھادی کے بارے میں اور بھی پریم اور جوش بڑھتا. ھم نے ان مرکزوں میں دیکھا کہ غریب عورتیں چار چار پانچ میل کی دوری سے چتھڑے لپیٹے ھوئے ایک چتھڑے میں اپنا کاتا ھوا سوت لاتیں. اور اس کے عوض میں کچھ پیسے نقد اور روئی لے جاتیں. کہیں کہیں تو دن بھر یہ سلسلہ جاری رھتا. مرکز میں کام کرنے والے سوت تول کر لینے اور روئی تول کر دینے میں دن بھر لگے رھتے. اگر کسی دن اتفاق سے روئی گھٹ جاتی یا پیسے گھٹ جانے سے سوت خریدنا بند کرنا پڑتا، تو ان غریبوں کا مایوسانہ چھرا دیکھ کر بہت دکھ ھوتا. ھم نے سمجھ لیا کہ کھادی کے پرچار کے بغیر ان غریبوں کا کوئی دوسرا سہارا نہیں ھوسکتا. جہاں کہیں مرکز کھولا جاتا وھاں غریبوں کے دل میں ایک نئی امید جھلکنے لگتی. اس

زمانہ میں کھادی کے متعلق خاصکر بہار میں سب سے بڑا سوال کھادی بیچنے کا رهتا. جتنی کھادی بیچ سکتے تھے اس سے کہیں زیادہ کھادی پیدا کرتے تھے. صوبہ کے باهر اور صوبہ میں همارا بہت وقت کھادی بیچنے اور بکوانے میں لگتا. کیونکه هم دیکھتے تھے که اسکی بکری اگر بڑھ جائیگی تو پیداوار میں کوئی خاص مشکل نہیں هوگی. جو لوگ ان باتوں کو ٹھیک نہیں سمجھتے تھے ان کو تعجب هوتا تھا که همارا وقت کیسے کٹتا هے. لیکن هم کو اپنی منشاء پوری کرنے کے لئے هی کافی وقت نہیں ملتا تھا. اس کام میں لگ جانے کے بعد کونسل کے جھگڑے سے بھی کچھ چھٹکارا ملتا. هم نے دیکھا که کانگریس کے اکثر لوگ «چٹ پٹے» کام میں هی زیادہ دلچسپی لیتے تھے. اس طرح کے تعمیری کام میں، جن میں سکون سے وقت صرف کرنا پڑتا، ان کا کم جی لگتا تھا.

کونسل میں داخلہ کے متعلق بحث کے وقت هم لوگوں کو ایك بات کی فکر رهتی. هم اس بات کے جاننے کے مشتاق رهتے تھے که مہاتماجی کا کیا خیال هے؟ کیا وہ سبھی بڑے بڑے لیڈروں کی مخالفت، جو هم کر رهے تھے، پسند کریں گے؟ کونسل

میں داخلہ کے متعلق ان کے خیالات کیا ہوں گے؟ ہمارے دل میں کوئی اندیشہ نہیں ہوتا تھا. ہم لوگوں کو یقین تھا کہ وہ داخلہ کی مخالفت ضرور کریں گے. لیکن خطرہ اس بات کا ہوتا تھا کہ سبھی بڑے بڑے لیڈروں کی مخالفت کرنی ہمارے لئے مناسب تھی یا نہیں. خاصکر ایسی حالت میں جب مخالفت کے سبب سے کانگریس کے اندر اتنی بڑی پھوٹ پڑگئی کہ ایک جماعت الگ پارٹی بنا کر کام کرنے پر اتر آئی. مہاتماجی کے خیالات جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، کیونکہ ان سے کسی قیدی کو بھی جیل میں ملنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا، جو پوچھنے پر کسی کو ان کے خیالات کو بتا سکتا. جو لوگ کبھی انسے باضابطہ ملنے جاتے تھے ان سے وہ کبھی کچھ نہ کہتے. کیونکہ جو بات کہنے کا ان کو باضابطہ اختیار نہیں تھا اسے کسی طرح کبھی اشارے سے بھی کہہ نہیں سکتے تھے. پہلے پہل تو ہم لوگوں کو کچھ پتہ اس وقت لگا جب شری شنکر لال بنکر جن کو ینگ انڈیا کے پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے مہاتماجی کے ساتھ اس مقدمہ میں دو سال کی سزا ملی تھی، اپنی میعاد پوری کر کے باہر نکلے تھے. اس وقت ہم لوگوں کو یہ معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا کہ مہاتماجی کے کونسل کے متعلق

خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی. جس وقت دلی کے
خاص اجلاس میں مولانا محمد علی نے سمجھوتہ کی بات پیش کی،
ہم لوگ اسے بالکل ناپسند کرتے تھے. شری راج گوپال اچاری،
جو اس وقت تک اہم تبدیلی نہ چاہنے والوں کی لیڈری کر رہے
تھے، جان بوجھکر دلی کانگریس میں نہیں آئے. سردار ولبھ
بھائی پٹیل اور میں اس سمجھوتے سے بہت رنجیدہ تھے، لیکن
ہم لوگوں کے سامنے دوسرا کوئی چارہ کار نہیں تھا. ہم نے مجبوراً
اس تجویز کو مان لیا. کیونکہ ہم نے سوچا کہ اگر ہم اس کو
نہیں مانتے ہیں تو ایک اور ٹولی کا لیڈر ہمارے مخالف ہو جائیگا.
مولانا محمد علی کا ذاتی خیال بالکل خلاف تھا، لیکن انہوں نے
سوراجیوں کو بغیر کانگریس کا نام لئے کونسل میں جانے کی
اجازت دے دی. جو تقریر انہوں نے کی اس میں انہوں نے
کونسل میں جانے سے جتنی برائیاں ہوسکتی تھیں سبھی بیان
کر دیں. آخر میں یہ بھی کہا کہ یہ سب ہوتے ہوئے بھی اگر
کچھ لوگ اس گھناؤنے کام کو کرنا ہی چاہتے ہیں. تو انہیں کرنے
دو، مرنے دو. اس مسئلہ پر بات چیت کے وقت انہوں نے
ایک بات اور کہی جس کا اثر ہم میں سے بہت سے لوگوں پر

پڑا. انھوں نے یہ کہا کہ کہیں سے ان کے پاس بے تار کی تار برقی سے خبر آئی ھے کہ جھگڑے کو ختم کرنا چاھئے، جو جانا چاھتے ھیں ان کو جانے دینا چاھئے. لوگوں نے سمجھ لیا کہ ان کا اشارہ گاندھی جی کی طرف تھا. لوگوں نے اس وجہ سے ان کی بات مان لی. لیکن بعد میں معلوم ھوا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی.

چودھواں باب

سنہ ۱۹۲٤ع کے شروع ھی سے میں ھائی کورٹ میں اس مقدمہ کا کام کرنے لگا جس میں میں نے سنہ ۱۹۲۰ع میں کام کیا تھا، اور جو اس وقت ھائی کورٹ میں اپیل کی شکل میں پیش ھوا تھا. کیونکہ عدالت ضلع میں ھمارے موکل ھار گئے تھے. نان کواپریشن شروع ھونے سے پہلے ھی میں نے ان کو زبان دے دی تھی اور اپنے سب دوستوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ اس مقدمہ میں جب ضرورت پڑیگی اسوقت میں کام کر دونگا. بس اتنا ھی مجھے یاد ھے کہ اس درمیان میں میں نے ایک بار ھائی کورٹ میں کام کیا تھا، جب کہ فریق مخالف ھمارے مؤکل کی تمام جائداد پر دخل یابی چاھتا تھا. اب جب اپیل پیش ھوئی تو اس وقت مجھے خاص کر اس لئے کام کرنا پڑا کہ ھمارے مؤکل ابتدائی عدالت میں ھار چکے تھے، اگر وہ اپیل میں نہ جیتتے تو سب کچھ کھو بیٹھتے. میرا ان سے اس وقت سے تعلق تھا جب میں پڑھتا تھا، میرے انگلینڈ بھاگ کر جانے کے وقت انھوں نے کچھ روپیوں سے بھی مدد کی تھی. وکالت شروع

کرتے ھی دھنی لوگوں میں سے ایک وھی ایسے تھے جنہوں نے ھائی کورٹ کے اپنے تمام مقدمات میں مجھے وکیل مقرر کر لیا تھا. جب وہ مقدمہ ان پر چلایا گیا تو ابتدا سے مجھے ھی انھوں نے لگا رکھا تھا. میں اپنا دھرم سمجھتا تھا کہ مجھ سے جو کچھ ھوسکے ان کے لئے کرنا چاھئے. خاصکر جب کہ وہ مشکلات میں تھے. اس لئے میں نے اپیل میں کام کرنا شروع کر دیا تھا.

ابھی بحث ھوئے چند ھی دن گذرے تھے کہ اخباروں سے معلوم ھوا کہ مہاتما گاندھی جی جیل میں بیمار پڑگئے ھیں اور پونا کے اسپتال میں لے جائے جا کر ان کے پیٹ میں نشتر دیا گیا ھے. میں نے پونا جانے کا ارادہ کیا اور دو چار دن کی چھٹی لیکر روانہ ھوگیا. پونا پھونچ کر میں نے اسپتال میں مہاتما جی سے ملاقات کی. وہ بہت کمزور ھو گئے تھے لیکن زندگی کے متعلق کوئی خطرہ نہیں تھا. مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ھوئے. میں نے اس کمزوری کی حالت میں ان سے کوئی بات کرنی مناسب نہیں سمجھی. اور اگر میں چاھتا بھی تو شاید وہ کسی سیاسی مسئلہ پر خود ھی باتیں نہ کرتے. کیونکہ وہ ابھی تک

قیدی تھے. میں ملاقات کر کے واپس پٹنہ چلا آیا اور ادھر گورنمنٹ نے ان کو رہا کر دیا. اچھے ہونے تک وہ پونا ھی رھے. اس کے بعد « جوھو » بمبئی میں سمندر کے کنارے حصول تندرستی کے لئے چلے گئے. سیاسی معاملات میں حصہ لینے کے قابل ہوتے ھی، کونسل کے متعلق جو جھگڑا تھا، اس میں انھوں نے ہم لوگوں کی تائید کی. لیکن ساتھ ھی یہ بھی کہہ دیا کہ ان کا یہ اس وقت کا خیال تھا، اب وہ دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال سے ملنے کے بعد اپنی آخری رائے قائم کریں گے.

میں تو مئی کے آخر تک اس مقدمہ میں لگا رھا. اس درمیان میں مہاتماجی کی بات چیت ان لوگوں سے ہوئی. انھوں نے ان لوگوں سے سمجھوتہ کرنا چاھا. جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سوراج پارٹی کونسل کا کام جیسا کرنا چاھتی ھے ویسا کرے، لیکن کانگریس کے تعمیری کام میں بھی وہ مدد دے. تعمیری پروگرام میں سب سے بڑا کام کھادی پرچار کا تھا، اس لئے انھوں نے تجویز کی کہ سبھی لوگوں کو چرخہ چلانا اور کانگریس کا چندہ سوت کی شکل میں دینا چاھئے. اس بات کو وہ لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، کیونکہ چرخہ کے مسئلے میں سب کو

پورا بھروسہ نہیں تھا. بہت سے تو چرخہ چلانے میں وقت کی بربادی ھی سمجھتے تھے اور بہت سے لوگوں کے دل میں یہ شک بھی تھا کہ اگر اس قسم سے کانگریس کا چندہ اپنے ھاتھ سے کتے ھوئے سوت کی شکل میں ھی دینے کا دستور ھوگیا تو کانگریس چرخہ چلانے والوں کے ھی ھاتھ میں چلی جائے گی اور وہ کانگریس پارٹی کے ساتھ نہ معلوم کیا برتاؤ کریں گے.

انھیں سب باتوں پر غور کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی بیٹھک ھوئی، جس میں مہاتماجی نے اپنی تجویز پیش کی. سوراج پارٹی کے نیتاؤں نے اس کی مخالفت کی، پھر بھی تھوڑے ووٹوں سے مہاتماجی کی تجویز کامیاب ھوگئی. لیکن اس جیت کو انھوں نے اپنی ھار کہا اور « ینگ انڈیا » میں ایک بہت ھی دردناک مضمون لکھا. اس کے بعد وہ اس فکر میں لگ گئے کہ سوراج پارٹی کے ساتھ کس طرح کا سمجھوتہ ھونا چاھئے. آخر میں ایک سمجھوتہ ھوا. پٹنہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی پھر بیٹھک ھوئی. سمجھوتہ کے ساتھ « آل انڈیا چرخہ سنگھ » قائم کیا گیا، جو کانگریس کے ذریعہ سے ایک مکمل لیکن اپنے کاروبار میں ایک آزاد انجمن مانی گئی. کانگریس کا جو کچھ دھن

• کھدر بورڈ » میں تھا وہ سب چرخہ سنگھ کے سپرد کر دیا گیا.
اس سمجھوتے کا مطلب یہ ھوا کہ اس طریقہ سے کانگریس کے
دو حصے مان لئے گئے: ایك کونسلوں میں کام کرنے کے لئے،
جس کا اختیار سوراج پارٹی کے ھاتھ میں دے دیا گیا اور
دوسرا تعمیری کام کے لئے، جو گاندھی جی کے ھاتھ میں رھا. ان
لوگوں کو کونسلوں میں جانے اور اس کے متعلق کسی قسم کی
مدد کرنے میں اصولی مشکل معلوم ھوتی تو ان کو اختیار دے
دیا گیا کہ وہ غیر جانبدار رہ سکتے ھیں، لیکن دوسرے لوگ جو
مدد دینی چاھتے ھیں دے سکتے ھیں اور جو خود کھڑا ھونا چاھتے
ھیں وہ امیدوار بھی بن سکتے ھیں. سوراج پارٹی کے لوگوں نے
وعدہ کیا کہ کونسل کے اندر یا باھر، ان سے جھاں تك ھوسکے گا.
تعمیری پروگرام کی مدد کریں گے. بیلگاؤں میں اس سال
کانگریس کا سالانہ جلسہ ھونے والا تھا. مھاتماجی اس کے
صدر ھوئے. بالاتفاق سمجھوتہ وھیں منظور ھوگیا.

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے متفقہ جلسہ کے بعد، جس میں
اپنی تجویز کو منظور کرانے کے بعد بھی مھاتماجی نے اپنی ھار
مانی تھی، ایك ایسا واقعہ پیش آیا جو بہت تلخ تھا، جسکا اثر

بہتوں کے دل پر گہرا ہوا. مہاتماجی اس تجویز کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے، ایک ممبر نے بیچ میں کچھ بول کر چھیڑ چھاڑ کی. جسکا اثر ان کے دل پر اتنا ہوا کہ بولتے بولتے انکی آواز بھرا گئی اور کچھ منٹ کے بعد وہ بالکل چپ ہو گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے. میں نے ایک ایسا منظر ایک دفعہ اور بھی دیکھا تھا، جسکا ذکر اس سے پہلے ایک جگہ کر چکا ہوں. مہاتماجی کی یہ حالت دیکھ کر بہت سے لوگ بے چین ہو گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے. مہاتماجی کے بیکل ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جن مہربان نے چھیڑ خانی کی تھی وہ مہاتماجی کے معتبر لوگوں میں سے تھے. ان کو اس بات کی بہت چوٹ لگی تھی کہ ایک ایسے آدمی نے اس طرح کی بات کیوں اٹھائی. ان بیچاروں کو بہت دکھ ہوا، انھوں نے بہت معافی مانگی. مہاتماجی اس واقعہ کے پہلے سے ھی بہت متاثر تھے. کیونکہ اس تجویز کے تھوڑے ووٹوں سے پاس ہو جانے کے بعد سوراج پارٹی کے لوگ دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال کے ساتھ جلسہ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور جلسہ میں ایسے ھی لوگ رہ گئے تھے جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ

مہاتماجی کے ساتھ ھیں. یہ بیٹھک احمد آباد میں ھوئی تھی. ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ھوا تھا کہ گاندھی جی اپنی ھار مان کر بہت زوروں سے اس کوشش میں لگ گئے کہ کسی نہ کسی طرح آپس کے جھگڑے کو ختم کرکے سوراج پارٹی کے ساتھ کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کر ھی لینا چاھئے. ھم نے دیکھا کہ اگر مہاتماجی چاھتے اور زور لگاتے تو کانگریس سوراج پارٹی کے ساتھ نہ جاتی اور سوراج پارٹی کو کانگریس سے الگ ھوکر ھی کام کرنا پڑتا. لیکن جہاں وہ اپنے خیالوں میں مضبوط رھنا چاھتے تھے وھاں وہ دوسروں کے خیالوں کا بھی پورا احترام کرتے تھے. اب جب انھوں نے دیکھ لیا کہ دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال نہرو جیسے لوگ اپنے خیال میں مضبوط رھنا چاھتے ھیں تو انھوں نے مخالفت چھوڑ دی اور اپنے خیالات پر قائم رھتے ھوئے بھی کانگریس کے ان لوگوں کو جو انکے کاموں میں سوراج پارٹی کی مدد کرنا چاھتے تھے، انھوں نے مدد کرنے کی اجازت دے دی. اس سے ان کی عظمت اور برتری اور بھی سب پر ظاھر ھوگئی. اس سے بھی بڑھکر دوسری مثال سنہ ۱۹٤۷ع میں دیکھنے میں آئی، جس کا ذکر اپنے موقع پر کیا جائے گا.

مہاتما جی کے جیل چلے جانے کے بعد ہندو مسلمانوں میں جو میل دیکھا گیا تھا اس میں کمی ہونے لگی تھی. اور جو لوگ کانگریس اور خلافت کمیٹی میں تھے ان میں تو کوئی خاص اختلاف ابھی تک دیکھنے میں نہیں آیا، لیکن عوام کے دلوں میں شک شبہ کی آگ سلگنے لگی. میں اوپر بتا چکا ہوں کہ مالابار کے موپلوں کے متعلق طرح طرح کی باتیں کسطرح کہی جانے لگی تھیں. سبب کچھ بھی ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ موپلوں نے بعض ہندوؤں کے ساتھ زیادتیاں ضرور کی تھیں. لیکن وہ باتیں بہت بڑھا چڑھا کر دوسری جگہوں پر کی گئیں. ہندوؤں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ مسلمانوں کو خلافت کے معاملہ میں مدد دے کر گاندھی جی نے اور ان کی لیڈری میں کام کرنے والے دوسرے ہندو نیتاؤں نے زبردست غلطی کی. ان لوگوں ھی کی وجہ سے مسلمانوں میں اتنی بیداری پیدا ہوئی. اور اس بیداری کا یہ نتیجہ ھے کہ اس طرح سے ہندوؤں کے ساتھ وہ لوگ زیادتی کرنے لگے. جو لوگ زیادہ سمجھداری سے باتیں کرنے کا دعوی کرتے تھے وہ یہ بھی کہنے لگے کہ اسلام کٹرپن سکھاتا ھے. اور چونکہ ساری خلافت تحریک مذھبی تحریک

تھی اس لئے اس کا ایک ھی نتیجہ ھوسکتا تھا. وہ یہ کہ مسلمانوں میں کٹرپن بڑھے. اسی کا ھی نتیجہ مالابار میں ھندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے اور صرف ھندو ھونے کی وجہ سے ان کے گھر بار لوٹے جانیکی شکل میں دیکھنے میں آیا. دوسری طرف مسلمانوں کا کہنا تھا کہ مالابار کی باتیں بہت بڑھا چڑھا کر ھندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف جذبہ ابھارنے کے لئے کہی گئی تھیں. اگر کہیں مسلمانوں نے کسی ھندو کے ساتھ زیادتی کی تو اس لئے نہیں کہ وہ ھندو تھا بلکہ اسلئے کہ اس نے موپلوں کے خلاف برٹش گورنمنٹ کی مدد کی. علی برادران کا کہنا تھا کہ کانگریس اور ھندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں میں بیداری نہیں پیدا ھوئی بلکہ اس بیداری کا سبب یہ تھا کہ ان کے مذھبی عقیدوں پر برٹش گورنمنٹ نے اپنے اعتبار سے گہری چوٹ دی تھی. اگر کانگریس یا گاندھی جی انکا ساتھ نہ دیتے تو بھی وہ اس مسئلہ کو لیکر برٹش گورنمنٹ سے ضرور لڑتے، چاھے اس لڑائی کا طریقہ کوئی دوسرا ھی کیوں نہ ھوتا، اور اسکا نتیجہ خواہ کچھ بھی ھوتا. کانگریس اور ھندوؤں نے جو مدد کی تھی اس کے وہ شکرگذار ضرور تھے، لیکن ھندوؤں اور کانگریس کو بھی یہ

نہیں بھولنا چاهئے کہ مسلمانوں کے آجانے سے ان کی بھی طاقت کتنی بڑھ گئی. اور اب وہ اس قابل ہوئے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ سے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں.

سنہ ۱۹۱۹ع دهلی اور جلیانوالہ باغ میں اور بہت سی جگہوں میں ہندو اور مسلمانوں کے خون ایک ساتھ بہے تھے. دونوں نے مل کر برٹش گورنمنٹ کا مقابلہ کیا تھا. جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے بعد دونوں کا میل جول اتنا بڑھ گیا تھا کہ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ اتحاد کبھی نہیں ٹوٹے گا. لیکن ایک مقام پر برا واقعہ ہونے سے آہستہ آہستہ اس دودھ اور پانی کے میل میں کھٹائی پڑ گئی. اگرچہ اس کا اثر فوراً دیکھنے میں نہیں آیا، لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ظاہر ہونے لگا. اسکی سب سے پہلی اور نمایاں مثال سنہ ۱۹۲۲ع میں مہاتماجی کے جیل جانے کے پانچ چھہ مہینہ کے اندر ملتان میں دیکھنے میں آئی. وهاں مسلمانوں کی آبادی بہت ہے اور ہندوؤں کی کم. مسلمانوں نے محرم میں بہت دھوم سے تعزیہ کا جلوس نکالا. بس ہندوؤں سے لڑائی چھڑ گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے بے قصور مارے گئے، بہت سے لوگوں کے

گھر لوٹے اور جلائے گئے. غرض کہ سینکڑوں طرح کی زیادتیاں ان کے ساتھ کی گئیں. مسلمانوں کا یہ کہنا تھا کہ «ہندوؤں نے تعزیہ کی بے حرمتی کی، اس پر ڈھیلے اور پتھر پھینکے، جس سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوا. اس وقت انہوں نے بلوہ اور فساد کیا». ہندوؤں کا کہنا تھا کہ «ان کو اس طرح کے پاگل پن کی کاروائی کرنیکی کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ وہ ایسا کرسکتے تھے، کیونکہ ان کی طرف سے لڑائی چھیڑنے کی کوئی تیاری نہیں تھی. شہر اور باہر کے مسلمان بہت بڑی تعداد میں ہتھیاربند ہوکر، جیسے کے تعزئے کے جلوسوں میں ہوا کرتا ہے، جلوس میں شریک تھے. ہندو ایسے بیوقوف اور ناسمجھ نہیں تھے کہ ایسے جلوس کیساتھ وہ چھیڑ چھاڑ کرتے. مسلمان ہندوؤں کو لوٹنے اور پیٹنے کے لئے تیار ہوکر آئے تھے، اس لئے انہوں نے تعزیہ پر پتھر پھینکنے کا صرف ایک بہانہ بنا کر لوٹ مار شروع کردی تھی». کانگریس اور خلافت والوں کا کہنا تھا کہ «اس میں نہ ہندوؤں کا قصور تھا نہ مسلمانوں کا بلکہ برٹش گورنمنٹ ہی ہندو مسلم اتحاد دیکھ کر گھبرا گئی تھی، اسی کے ملازموں نے یہ جھگڑا کرایا. یہ ہوسکتا ہے کہ ڈھیلے اور پتھر تعزیہ پر

جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں، پھینکے گئے ہوں، مگر وہ ہندوؤں نے نہیں پھینکے تھے، یہ کام تو گورنمنٹ کے آدمیوں کی طرف سے کیا یا کرایا گیا تھا. انھوں نے مسلمانوں میں اشتعال پیدا کر کے ہندوؤں کو لٹوایا. پٹوایا اور مروایا». اس وقت وہاں کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایمرسن تھے. وہ بہت ہوشیار اور چالباز افسر سمجھے جاتے تھے. بہت سے لوگوں کا تو یہی کہنا تھا کہ اس فساد کی جڑ وہی تھے. ان کی ترقی بھی بعد میں بہت ہوئی. وہ تھوڑے ہی دنوں بعد گورنمنٹ آف انڈیا میں ہوم سکریٹری اور بعد میں پنجاب کے گورنر بھی ہو گئے.

جو بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی تھی. جب اس کی خبر ملی تو اس وقت حکیم اجمل خان کیساتھ، جو کانگریس کے صدر بھی تھے، ہم سب لوگ، جن میں پنڈت مدن موہن مالوی. سیٹھ جمنا لال بزاز، شری پرکاشم وغیرہ بھی تھے، اور میں بھی تھا، ملتان گئے. وہاں اسٹیشن پر اترتے ہی ہم لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ ہندو اور مسلمانوں میں بہت بڑی کشیدگی ہوگئی ہے. اب وہ اسی پر جھگڑنے لگ گئے کہ ہم لوگ کہاں ٹھہرائے جائیں. ہندو سمجھتے

تھے کہ ہم لوگ اگر مسلمانوں کے انتظام میں ٹھہرائے گئے تو صرف مسلمانوں ھی کی بات سن کر ہم اپنی رائے قائم کرلیں گے، اور مسلمانوں کو بے قصور مان لیں گے. اسی طرح مسلمان سمجھتے تھے کہ اگر ہم ھندوؤں کے انتظام میں ٹھہرائے گئے تو ہم ھندوؤں کی بات سن کر مسلمانوں ھی کو قصوروار قرار دیں گے. لیکن ہم لوگ قصور کی جانچ کرکے قصوروں کو متعین کرنے کے لئے ھی وھاں نہیں گئے تھے، بلکہ دکھیوں اور مصیبت زدوں کو تسلی دینے اور آپس کے پھٹے ہوئے دلوں کو پھر سے جوڑنے گئے تھے. ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں دو جماعتوں میں بانٹ کر ایك کو ھندو ٹھہرائیں اور دوسری کو مسلمان. میں اور حکیم اجمل خان کیساتھ ایك مسلمان نواب کے ھاں ٹھہرایا گیا. دوسرے لوگ مالوی جی کے ساتھ کسی ھندو کے باغ میں ٹھہرے.

ہم سب ساتھ مل کر ان مقاموں کو دیکھنے گئے جن کو مسلمانوں نے لوٹا اور جلایا تھا، ان ھندو مردوں اور عورتوں سے بھی ملاقات کی جن کے گھر کے لوگ مارے گئے تھے. وہ منظر بہت ھی تکلیف دہ تھا. گھر کا جو سامان نہ لوٹا جاسکا اسکو انھوں نے اکٹھا کرکے آگ لگا دی اور جلادیا. جہاں آگ

نہیں لگائی وہاں سب چیزوں کو ایک ایک کرکے توڑ ڈالا، یہاں تک کہ گیہوں پیسنے کی چکی اور مسالہ پیسنے کی سل اور بانٹ بھی نہیں چھوڑے۔ ایک جگہ تو میں نے یہ بھی دیکھا کہ پنجرے کو جس میں طوطا پلا ہوا تھا، طوطے کے ساتھ گھر کے جلتے ہوئے سامان کی آگ میں ڈال دیا تھا۔ عورتوں نے رو رو کر اپنے دکھڑے سنائے۔ اس کا اتنا اثر ہوا کہ حکیم اجمل خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہم ہندوؤں کے دل تو پر گہرا اثر پڑ ہی رہا تھا۔ ڈپٹی کمشنر سے بھی ہم لوگوں کی ملاقات ہوئی۔ مالوی جی نے اس بات پر بہت زور دیا کہ قصورواروں کو سخت سزا ملنی چاہئے۔ یہ بات مجھے کھٹکتی تھی، لیکن وہاں کوئی دوسرا علاج ہی نہیں تھا۔ پہلے ہم لوگوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ جلسے کئے۔ دونوں کو حکیم صاحب اور مالوی جی نے سمجھایا۔ اس کے بعد دونوں کے ملے جلے جلسے ہوئے۔ جس سے کسی حد تک دونوں میں دشمنی کا جذبہ کم ہوا۔ ہم لوگوں کے وہاں جانے کا اثر اچھا ہوا۔ اور وہاں کچھ پرامن فضا قائم کرکے ہم لوگ واپس آئے۔ مالوی جی نے وہاں بھی ایک بات کہہ دی تھی، وہ یہ کہ ہندوؤں کے متحد نہ ہونے

کی وجہ سے ھی ان کے ساتھ اس قسم کی زیادتی ہوئی. اس لئے ان کو اب متحد ہوجانا چاھئے. اس بات کو انھوں نے بڑی خوبی سے کہا، جس سے ھندو مسلم دشمنی بڑھنے کا خطرہ پیدا نہیں ھوسکتا تھا اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا کہ ھندوؤں کا اتحاد مسلمانوں سے لڑنے کے لئے یا ان کی مخالفت کے لئے کیا جائےگا.

مسلمانوں میں فضا کچھ سدھر گئی. لیکن یہ بات چھپی نہ رھی. دوسری جگہ کے ھندوؤں میں بھی کچھ جوش پیدا ھوا، ھندوؤں کو متحد کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی. تھوڑے ھی دنوں بعد «گیا» میں کانگریس ھونے والی تھی. کچھ ھندوؤں نے ھندو سبھا کرنے کا خیال کیا. محترم مالوی جی کو صدر بنانے کا ارادہ ھوا. مالوی جی نے صدر بننا اس شرط پر منظور کیا کہ میں بھی سبھا میں شریك ھوں اور ان کو دعوت دوں. میں نے اس بات کو منظور کرلیا، کیونکہ مجھے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آئی. بعد میں جب ھندو سبھا کا کانگریس سے اختلاف ھوا تو مالوی جی نے اس بات کو مجھے یاد دلایا کہ میرے ھی کہنے پر انھوں نے «گیا» میں صدر ھونا منظور کیا تھا. بہرحال جو کچھ ھو، سبھا «گیا» میں پوری کامیابی سے

ختم ہوئی. سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ہندوؤں کا وہاں الگ سنگھٹن قائم کرنا طے پایا.

سوامی شردھا نند جی نے مالوہ کے راجپوتوں کو جو مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن ان میں اب بھی ہندو دستوروں کی علامتیں موجود تھیں اور ہندوؤں کے رسم و رواج کو بہت سی باتوں میں وہ مانتے تھے، ان کو شدھہ کر کے ہندو بنانے کی کوشش کی. مسلمان خواہ کسی جماعت اور خیال کا کیوں نہ ہو، کسی ہندو کا مسلمان بنانا برا نہیں سمجھتا، لیکن سوامی شردھانند جی کی شدھی تحریک کی وجہ سے ان سے مسلمان بہت بگڑ گئے، یہاں تک کہ ان کے جانی دشمن بھی ہو گئے. کہیں کہیں ہندو مسلمان بلوے بھی ہوتے رہے. نتیجہ یہ ہوا کہ آپس کی دشمنی بڑھنے لگی.

سوامی شردھانند سنہ ۱۹۱۹ع میں، جب دھلی میں «رولٹ قانون» کے خلاف تحریک میں مسلمان بھی شریک تھے، پولیس کی بندوقوں کے سامنے سینے کھول کر کھڑے ہو گئے تھے. اسوقت وہ مسلمانوں میں بہت محبوب ہو گئے تھے. یہاں تک کہ مسلمانوں نے ان کو جامع مسجد کے اندر کھڑے ہو کر تقریر کرنے کے لئے مجبور کیا تھا. وہی سوامی جی اس شدھی تحریک کی وجہ

سے مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن سمجھے جاتے تھے. آخر میں دسمبر سنه ١٩٢٤ع میں ایك مسلمان کے هاتھ سے ان کا قتل هو هی گیا. یه قتل کئی برسوں کے بعد هوا، لیکن اس کے لئے فضا سنه ١٩٢٣ع هی سے تیار هونے لگی تھی.

مہاتماجی نے جیل سے نکلنے کے بعد ایك طرف کانگریسیوں میں کونسل کے سوال پر اختلاف دیکھا اور دوسری طرف یه دیکھا که جو هندو مسلم اتحاد اتنے لوگوں کی محنت اور ایثار کے بل سے انهوں نے قائم کیا تھا، وہ آپس کی لڑائیوں کے سیلاب میں نیست و نابود هوگیا. اس سال ایك زبردست فساد کوهاٹ میں هوگیا تھا، جس میں هندوؤں کے ساتھ بڑی زیادتیاں هوئی تھیں. مہاتماجی کا «علی برادران» پر اٹل بھروسه تھا، وہ دونوں بھی مہاتماجی کا ویسا هی احترام کرتے تھے. کوهاٹ کے جھگڑے کے متعلق مہاتماجی نے مولانا شوکت علی کے ساتھ جا کر جانچ کرنے کا اراده کیا. لیکن دونوں کا ایك رائے پر قائم نه هونے کی وجه اور اختلاف هوگیا. مہاتما جی بہت هی بڑے آدمی تھے، کبھی اپنے منه سے حتی الامکان کسی کی شکایت نہیں کیا کرتے تھے. اس موقع پر بھی انهوں نے کوئی شکایت نہیں

کی ، لیکن یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اب تک جیسا ایک دوسرے پر اٹل اور ہمیشہ قائم رہنے والا بھروسہ تھا وہ اب نہیں رہا. لیکن اس بات کو انھوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا، کام عموماً جیسا پہلے چلتا تھا چلتا رہا.

ان جھگڑوں سے مہاتماجی کچھ اتنے گھبرا گئے تھے کہ انھوں نے یہ سوچا کہ ان کو روکنے کے لئے کوئی بہت بڑا قدم رکھنا ضروری ہوگیا. ابھی چند ماہ قبل وہ زبردست بیماری سے، جس کے لئے ان کے پیٹ میں نشتر دیا گیا تھا، اٹھے تھے، لیکن انھوں نے جان کی پرواہ نہ کرکے اکیس دنوں کا روزہ رکھنے کا ارادہ کرلیا، ان دنوں وہ دھلی میں تھے، وھاں مولانا محمد علی کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے، وھیں انھوں نے روزہ رکھنے کا خیال مستحکم کیا. مولانا محمد علی اور دوسرے بہت سے لوگوں نے اس خیال کے روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ اپنے ارادے میں اٹل اور قائم رہے، آخر انھوں نے روزہ وھیں شروع کر دیا. مولانا محمد علی اس زمانہ میں کانگریس کے صدر تھے. اس خبر کے چھپتے ھی فکر اور پریشانی کی لہر دوڑ گئی. مولانا محمد علی نے سب ھی

جماعتوں اور مذہبوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس طلب کی، اس میں کانگریس کے علاوہ ہندو، مسلم، عیسائی، سکھ، پارسی سبھی جماعتوں کے نمائندے حاضر ہوئے. عیسائیوں کے سب سے بڑے پادری کلکتہ کے «لارڈ بشپ» بھی کانفرنس میں آئے. کئی دن تک بحث ہوئی. آخر میں جھگڑوں کے جو اسباب ہوا کرتے تھے، مثلاً شدھی، گائے کی قربانی، مسجد کے سامنے باجا بجانا وغیرہ وغیرہ، ان سبھی باتوں پر تجویزیں منظور ہوئیں. مہاتماجی کو اس سے اطمینان ہوا. انھوں نے اکیس دن کے روزے کا جو عہد کیا تھا اسے پورا کر کے ہی روزہ ختم کیا.

میں روزہ شروع ہونے کے ایک دو روز بعد دھلی پہونچ گیا تھا. مہاتماجی، مولانا محمد علی کے گھر ہی میں تھے. دو تین دن کے بعد وہ شہر کے باہر ایک کوٹھی میں لے جا کر رکھے گئے. روزے کے باقی دن انھوں نے وہیں گذارے. میں دوسری جگہ ٹھہرا تھا، لیکن تقریباً سارا دن اور رات کا کچھ حصہ بھی وہیں گذارا کرتا تھا. مہاتماجی کا استقلال، خدا پر بھروسہ اور انکے اپنے مقررہ پروگرام میں مستعدی کی جیسی مثال وہاں دیکھنے میں آئی ویسی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی.

مہاتماجی کا ایک یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ روز چرخہ کاتا کرتے تھے۔ ان اکیس دن کے روزے میں بھی انہوں نے چرخہ چلانا ایک دن بھی نہیں چھوڑا۔ روزہ کے کچھ دن گذر جانے کے بعد وہ اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ ان کے لئے اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا تھا۔ پھر چاروں طرف تکیہ لگا کر ان کے سہارے سے وہ بٹھا دئے جاتے، وہ اپنے معمول کے مطابق چرخہ کات لیا کرتے۔ آخر میں انہوں نے جس دن روزہ ختم کیا وہ دن بھی چرخہ چلانے کے بعد ھی اس کو ختم کیا۔ پرارتھنا تو مقررہ وقت پر روزانہ صبح و شام ھوا ھی کرتی تھی۔ محترم مالوی جی کچھ دیر کے لئے روزانہ «شری مد بھگوت گیتا» کی کتھا سنایا کرتے تھے۔ خدا پر ان کا بڑا اٹل بھروسہ تھا، اس بات کو وہ مانتے تھے کہ خدا کو اگر ان سے کچھ اور کام لینا ھے تو وہ روزے کی میعاد کو حسن و خوبی سے ختم کرا دے گا۔ ڈاکٹر انصاری ان کو برابر دیکھا کرتے، پیشاب وغیرہ بھی جانچا کرتے۔ ان کا خیال تھا، اور روزہ شروع ھونے سے پہلے ھی انہوں نے مہاتماجی سے بہت کچھ کہہ کر یہ وعدہ لے لیا تھا کہ اگر ایسا سمجھا گیا کہ روزہ کی وجہ سے ان کی جان خطرہ میں ھے تو

اس حالت میں ، چونکہ وہ روزے کی وجہ سے مرنا نہیں چاہتے تھے ، روزہ توڑ کر وہ کچھ کھانے بھی لگیں گے . اس وجہ سے ڈاکٹر انصاری اس خیال سے دن میں کئی بار دیکھتے اور امتحان کرتے . پیشاب دیکھنے میں ان کو ڈر ہونے لگا . کہ وہ کٹھن وقت اب نزدیك آرہا ہے . اس بات کی اطلاع انہوں نے مہاتماجی کو دی . دوسرے دن انہوں نے صاف کہہ دیا کہ « اب روزہ رکھنا خطرناك ہوگا آج آپکو غذا لینی ہی چاہئے » . مہاتماجی نے ان سے کہا کہ « آپ نے کیا سب باتیں سوچ لی ہیں اور سب کچھ دیکھ لیا ہے ؟ . کیا پھر بھی آپ کی یہی قطعی رائے ہے ؟ . لیکن آپ کے فن میں ایك بات کا ذکر نہیں ہوگا ، اور وہ پرارتھنا ہے . صرف آج مجھے چھوڑ دیجئے ، کل اگر ایسی ہی حالت رہی تو میں اپنے عہد کو پورا کردوں گا اور کھانا کھالوں گا » . دوسرے دن جب ڈاکٹر انصاری نے امتحان کرکے دیکھا تو وہ سب علامتیں ، جن سے انہوں نے خطرہ محسوس کیا تھا ، غائب ہوگئی تھیں . ان کو خود بھی اس کا بڑا اچنبھا ہوا . اس کرامت کا حال انہوں نے اپنے تمام مخلص دوستوں کو بتایا .

مہاتماجی نے اس کے بعد کئی بار اکیس دن کے روزے

رکھے. لیکن چونکہ یہ وقت پہلا تھا اس لئے لوگوں کو بڑی پریشانی تھی. لیکن روزہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا. اب دھلی کے جلسہ کے بعد فضا بہت سدھری ہوئی معلوم ہوئی. ایسا معلوم ہونے لگا کہ آپس کے جھگڑے اب نہیں ہوں گے. اگر کہیں جھگڑے کا سبب دیکھنے میں آیا بھی تو آپس کی بات چیت یا پنچایت سے جھگڑے کا فیصلہ ہوجایا کرے گا. لیکن جتنے جوش اور خوش دلی سے دھلی کا اجتماع ختم ہوا تھا وہ قائم نہ رہ سکا. ان کامیابیوں کا جتنی شدت سے پرچار ہونا چاھئے تھا وہ بھی نہ ھوا. تھوڑے دنوں کے بعد ایسا معلوم ھوا وہ فیصلے صرف مہاتماجی کے روزہ سے پیدا ھوئی پریشانی کی وجہ سے ھوئے تھے، ان فیصلوں میں وہ ایقان اور بھروسہ نہیں تھا جو ان کو ھندو مسلمان کے دل میں مضبوط مقام دلوا سکتا. وقتی کامیابی کے کچھ دنوں بعد پھر آپس کے جھگڑے بلوے اور فساد شروع ھوگئے. مہاتماجی نے «بیل گاؤں» کانگریس کے اجلاس سے پہلے اس قسم کے دو سوالوں کا، جو ملک کو فکرمند کر رہے تھے، حل نکال کر «بیل گاؤں» کانگریس کی کامیابی کے لئے فضا تیار کر لی تھی.

مہاتماجی نے روزے کئی بار رکھے، جو خاص سبب سے ھی ھوئے. روزوں کے متعلق ان کا یقین اٹل تھا، وہ ان کو نفس کی صفائی کا صحیح ریاض مانتے تھے. یہ بھی سمجھتے تھے کہ کسی مسئلہ میں اگر کامیابی نہیں ھوتی تو اس کا سبب کچھ اپنی ھی خامی ھے. جب صفائی نفس سے وہ سبب دور ھو جائے گا اسوقت کام ضرور ھو جائے گا. جو لوگ گہرائی میں پھونچ کر ان کے خیالوں کو نہیں سمجھ پاتے تھے، اور ملک کے اکثر لوگ ایسے ھی تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ مہاتماجی دوسروں پر دباؤ ڈال کر کام پورا کرانے کیلئے روزے رکھتے ھیں. لیکن ان کے روزے کا نہیں بلکہ ان لوگوں پر جو ان کے ساتھ پریم رکھتے تھے، ان کے پریم کا ھی دباؤ پڑتا تھا. ھاں جو مخالف تھے ان پر محبت کا دباؤ پڑ ھی نہیں سکتا تھا. لیکن ایسے لوگ عام رائے سے، جو روزہ کی وجہ سے بیدار ھوا کرتی تھی. ضرور ڈرتے تھے. اور جو عام رائے کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے ان پر کوئی خاص اثر دیکھنے میں نہیں آتا تھا. لیکن مہاتماجی کو یقین تھا کہ اگر کوئی اثر دیکھنے میں بھی نہیں آتا تو بھی دباؤ پڑے بغیر نہیں رہ سکتا. کیونکہ اصل مقصد تو نفس کی

صفائی ہوتا ہے، جو بغیر ہوئے نہیں رہ سکتا. جب کبھی اس سلسلے میں دوسرے پر دباؤ ڈالنے کا ان کو احساس ہوا، جیسا کہ راجکوٹ کا روزہ تھا، جس کے متعلق انھوں نے بہت کچھ لکھا تھا، تو اس روزہ کو محض اس دباؤ کی وجہ سے انھوں نے غلط اور ناکامیاب بتایا، اگرچہ ظاہر طور پر کامیاب سمجھا جاتا تھا.

پندرھواں باب

اس وقت سے تقریباً پانچ سال تک مہاتماجی اپنا وقت خاصکر تعمیری کاموں میں ھی صرف کرتے رھے. سیاست کا کام، یعنی برٹش گورنمنٹ کو کس طرح مجبور کیا جائے تاکہ وہ ھندوستان کو سوراج دے دے، سوراج پارٹی کے ذمہ رھا. اگرچہ دھلی اسمبلی میں سوراج پارٹی کی اکثریت نہیں تھی پھر بھی دوسری جماعت کے لوگوں کے ساتھ مل کر اس نے اپنے پروگرام میں کامیابی حاصل کی. کیونکہ بجٹ کو نامنظور کرکے وائسرائے کو وہ مجبور کرسکی تاکہ وہ اپنے مخصوص اختیاروں سے کام لیں. لیکن سوراج پارٹی کے اندر بھی کچھ اختلاف رائے بھی دیکھنے میں آیا. وہ اختلاف رائے اس بات میں تھا کہ کونسلوں کے اندر یکبارگی اور مکمل عدم تعاون کیا جائے، یا جہاں نان کواپریشن کے لئے برٹش گورنمنٹ کا قانون مجبور کرے، وھاں تو عدم تعاون کیا جائے. جہاں حب وطن کے لئے برٹش گورنمنٹ کا قانون موقع دے وھاں تعاون بھی کیا جائے. پنڈت موتی لال جی نہرو اور دیش بندھو داس کی موت کے بعد، جو

سوراج پارٹی کے لیڈر تھے وہ عدم تعاون کے پورے طرفدار تھے. سوراج پارٹی کا جنم بھی اس قسم کے عدم تعاون کیلئے ہوا تھا. اس وقت سے اب تک پارٹی کے لوگ عدم تعاون ھی کی دوھائی دیا کرتے تھے. لیکن کچھ دوسرے لوگ، جن میں مہاراشٹر کے بعض بڑے لوگ بھی تھے، انقلابی عدم تعاون کی موافقت میں آواز اٹھانے لگے. اس وجہ سے آپس میں تلخی بھی ھوگئی. آخر میں سوراج پارٹی اور اس کی صلاح سے کانگریس نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ سوراج پارٹی کے لوگ کونسل سے نکل آئیں. وہ لوگ نکل بھی آئے. تھوڑے دنوں کے بعد پھر چناؤ ھونے والا تھا. اس انتخاب میں سوراج پارٹی نے صرف اپنے ھی نام سے نہیں بلکہ کانگریس کے نام سے بھی حصہ لیا. اس لئے کچھ زیادہ کامیابی بھی ھوگئی. لیکن اس انتخاب میں ھندو مسلم فسادوں کی وجہ سے جو کشیدگی ھوگئی تھی، اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ پنڈت مدن موھن مالوی اور لالہ لاجپت رائے جیسے معزز لوگ کانگریس کی مخالفت مین ھندو سبھا کی طرف سے الکشن لڑے. جو انقلابی عدم تعاون کے طرفدار تھے وہ لوگ بھی کانگریس کے خلاف الکشن لڑے. لیکن

پھر بھی اس وقت کے آئین کے اعتبار سے جو جیت ہوسکتی تھی وہ زیادہ تو کانگریس ہی کو ہوئی. مہاتماجی نے سوراج پارٹی کے لوگوں کو پورا موقع دیا کہ وہ جس طرح چاہیں اپنا پروگرام چلائیں. کانگریس سے بھی وہ لوگ جو کام لے سکتے تھے، اس کا ان کو کافی موقع دیا گیا. نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ چار پانچ سال تک پروگرام آزمائش کرکے موتی لال وغیرہ بھی کونسل چھوڑ کر نان کواپریشن ستیہ گرہ کے پروگرام میں پھر آگئے. یہاں تک پہنچنے میں ان کو کئی سال لگ گئے. لیکن اس کی علامتیں سنہ ۱۹۲٤ ع میں دیش بندھو داس کی زندگی کے آخر زمانے میں دیکھنے میں آنے لگیں.

دیش بندھو داس نے سوراج پارٹی جہاں تک اپنے پروگرام کو چلا سکتی تھی چلانے کی کوشش کی. دو صوبوں یعنی مدھیہ پردیش (سی پی) اور بنگال میں یا تو وزارت بنی ہی نہیں، یا بنگال میں بنی بھی تو توڑ دی گئی. مرکزی اسمبلی میں بار بار بجٹ نامنظور کیا گیا. اس درمیان میں گورنمنٹ نے کبھی کبھی اپنی طاقت بھی خوب استعمال کی. سوراج پارٹی اس کو روکنے مین کچھ کامیاب نہ ہوسکی. اس طرح کونسل کے اندر سے عدم

تعاون کی کمزوری ظاہر ہونے لگ گئی تھی. لیکن دیش بندھو داس نے سوچا کہ سوراج پارٹی نے اپنی طاقت دکھلا دی. اگر اس کے بعد وہ سمجھوتہ کرنے کے لئے بھی اپنی آمادگی ظاہر کرے تو شاید برٹش گورنمنٹ بات چیت کرکے راستہ نکالنے کو تیار ہو جائے. اس زمانہ میں انگلینڈ میں لارڈ برکن ہیڈ، جو ایک کنزرویٹو (قدامت پسند)، تیز مزاج اور نڈر سیاست دان سمجھے جاتے تھے، وزیر ہند ہو گئے تھے. دیش بندھو داس کو ان سے بہت امید تھی. دیش بندھو داس کچھ دنوں کے لئے پٹنہ میں ٹھہرے تھے. باتوں ہی باتوں میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کو لارڈ برکن ہیڈ سے بہت امید ہے، لیکن اگر لارڈ برکن ہیڈ نے ان کو نا امید کیا تو پھر ان کے سامنے مہاتماجی کے چرخہ کے سوا دوسرا راستہ نہیں رہ جائیگا. یعنی گاندھی جی کے پروگرام ہی کو انہیں ماننا پڑے گا. اس امید پر کہ لارڈ برکن ہیڈ ان کی باتوں پر دھیان دیں گے انہوں نے ایک بیان دیا. تھوڑے ہی دنوں کے بعد بنگال پراونشل پولیٹکل کانفرنس (بنگال صوبائی سیاسی کانفرنس) کے صدر ہو گئے. اس تقریر سے، جو انہوں نے کی، سمجھوتہ کرنے کی خواہش ظاہر ہوتی

تھی. لارڈ برکن ھیڈ نے کچھ میٹھے لفظوں کے ساتھ ساتھ لیکن صاف ظاہر کردیا کہ وہ اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے، جب تک سوراج پارٹی نان کواپریشن کا پروگرام چھوڑ نہیں دے گی. دیش بندھو داس کے دل پر اس بات کی چوٹ لگی. ان کی تندرستی کئی مہینے سے گرتی جا رھی تھی. اس کے تھوڑے ھی دنوں بعد دارجلنگ میں ان کی موت ھوگئی.

جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے، انکی وفات کے بعد موتی لال نہروجی کی لیڈری میں سوراج پارٹی کے زیادہ تر لوگ نان کواپریشن قائم رکھنے کے موافق ھوگئے تھے. کچھ لوگ انقلابی نان کواپریشن کے موافق ھوگئے. سوراج پارٹی میں پھوٹ پڑگئی. جو جذبہ دیش بندھو داس کے زمانہ میں مدھم دیکھنے میں آیا، وھی روز بروز مضبوط ھوتا گیا. سنہ ۱۹۲۸ع کے آخر میں ظاھر ھوگیا کہ اب کونسل سے کام نہیں چلے گا. نان کواپریشن کو سخت شکل میں کوئی طریقہ اختیار کرنا ھی پڑے گا.

ان چار پانچ برسوں میں مہاتماجی، جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے. اپنا وقت خاصکر تعمیری کام ھی میں صرف کرتے رھے. یہاں پر تعمیری کام کی اگر کچھ تفصیل دی جائے تو بہتر ھوگا. مہاتماجی

چرخہ اور کھادی کو تعمیری کام کے پروگرام کا مرکزی نقطہ یا مرکز مانتے تھے. سنہ ۱۹۲٤ع سے کھادی بورڈ، جو کوکناڈا کانگریس کے بعد قائم ھوا تھا، اس کا کام چلاتا رھا. اسکے لئے کانگریس کے « تلک سوراج فنڈ » سے کافی رقم بھی ملی تھی. جب سوراج پارٹی کے ساتھ سمجھوتہ ھوگیا اس وقت آل انڈیا چرخہ سنگھ کا قیام آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ کیا گیا. سمجھوتے کی شرطوں میں تھا کہ اس طرح کے کام گاندھی جی کے ذمہ رھیں گے اور سوراج پارٹی کے لوگ حتی الامکان مدد کیا کریں گے. اسلئے چرخہ سنگھ نے کانگریس کے ذریعہ جنم لیا، لیکن اپنے کام میں ایک آزاد ادارہ رھا. جو کچھ کانگریس کا روپیہ یا دھن کھدر بورڈ کو ملا تھا، سب چرخہ سنگھ کو دیا گیا. گاندھی جی کا بہت سا وقت چرخہ سنگھ اور اس کے ماتحت صوبوں کے چرخہ سنگھوں کی تنظیم میں لگ گیا. اس کام کو بڑھانے کے لئے اگر زیادہ روپیوں کی ضرورت ھوئی تو مہاتماجی دورہ کرکے روپے جمع کرتے. وہ خود چرخہ سنگھ کے صدر تھے. اسکی تمام باتوں کی دیکھ بھال کرنا اور اسکو صحیح راستہ دکھانا ان کا خاص کام رھا. ان دنوں چرخہ سنگھ

کا اصول تھا کہ چرخہ بہتر بنایا جائے، جس میں اور بھی اچھی اور زیادہ ترقی ہو اور بنائی کا کام بھی بڑھے. اس لئے اسکے متعلق بہت سے مضامین مہاتما جی لکھتے رہے. اپنی تقریروں میں بھی بہت باتیں بتاتے رہے. جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی جگہوں میں چرخہ کا کام منظم شکل میں چلنے لگا. تمام جگہوں پر ایسے اچھے کارکن ملے جنہوں نے اس تنظیم میں بہت مدد پہونچائی.

چرخہ کی ترقی کئی طرح سے دیکھنے میں آئی. اچھے سے اچھا باریک سوت بننے لگا. موٹے اور باریک سوت دونوں قسم کے کپڑے بہت زیادہ تیار ہونے لگے. اچھے سے اچھے نمونہ کی کھادی بنی جانے لگی، جو مل کے ہر طرح کے بنے ہوئے کپڑے سے مقابلہ کرسکتی تھی. کھادی کا رواج بڑھانے کے لئے کپڑے کی رنگائی اور چھپائی بھی ہونے لگی. ہر ایک کھادی بھنڈار اور صوبائی شاخ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور اچھی سے اچھی کھادی تیار کرائے. ساتھ ہی اپنے صوبہ میں یا باہر، جہاں کہیں بھی ہوسکے، بیچ کر کام بڑھائے. اس کے سوا یہ بھی کوشش تھی کہ کھادی قیمت میں بھی مل کے کپڑے کا

مقابله کرسکے. اس لئے کھادی کے دام گھٹانے یا کم از کم خرچه میں
اسے تیار کرکے بیچنے کی تدبیر تمام مرکز اور بھنڈار کرتے تھے.
باریك کھادی مہنگی پڑتی ، مل کے مہین کپڑے کے مقابله میں اس
کی قیمت زیادہ ہوتی. لیکن موٹے کپڑے میں اتنا زیادہ فرق نہیں
تھا. لوگ زیادہ تر مہین کپڑے ھی پسند کرتے ، لیکن وہ کم تیار
ہوتا. بکری بڑھانے کے لئے اور پرچار کے خیال سے لوگ زیادہ
مہین کپڑے ھی پسند کرتے ، لیکن وہ کم تیار ہوتا تھا. بکری بڑھانے
اور پرچار کے خیال سے جگه جگه نمایش کی جاتی ، جس میں
ھر قسم کی کھادی دکھائی اور بیچی جاتی. نمایش بڑے پیمانے پر
کی جاتی ، اس میں کھادی بننے کے طریقے بھی دکھائے جاتے.
کام کرنیوالے کاریگر کپاس تولنے سے شروع کرکے اوٹائی. دھنائی ،
کتائی ، بنائی ، رنگائی ، چھپائی وغیرہ تك تمام قسمیں دکھاتے. ان
کاموں کے لئے جو نئی نئی مشینیں جس صوبے میں تیار ہوتیں
وہ دکھائی جاتیں. سابرمتی کا آشرم تو اس تحقیقات میں لگا رہتا
که کونسی مشین ایجاد کی جائے ، اور کس طرح سوت اتنا
مضبوط اور برابر کاتا جائے که اس کو آسانی سے بنا جاسکے. ان
سب کے لئے وہ آشرم تجربه گاہ بن گیا تھا. دوسری جگہوں میں

بھی صوبہ واری شاخیں اپنے اپنے میدان میں تحقیقات اور تجربہ کا کام کرتی رہیں۔ اچھے سے اچھے بہت سی قسم کے چرخے نکلے، جن کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ کھادی کا رواج بڑھے۔ اس رواج کے ساتھ ساتھ سوت کی مضبوطی ستھراپن اور باریکی پر بھی زیادہ دھیان دیا جانے لگا۔

کپاس کی کھیتی کے علاوہ ریشمی کھادی کا بھی کافی رواج ہوا۔ جہاں کہیں ریشم کا کام پہلے سے کچھ ہوتا تھا وہاں بہت بڑھگیا۔ کیونکہ ریشمی کپڑے کی بکری کا، چرخہ سنگھ ایک اچھا ذریعہ ہوگیا۔ بدیشی ریشمی کپڑا بہت چالو تھا۔ اب ریشمی کھادی خوبصورتی اور قیمت میں بدیشی ریشمی کپڑے کا اچھی طرح سے مقابلہ کرنے لگی۔ چرخہ سنگھ کا اصول کپاس کی کھادی کو زیادہ مدد دینا تھا۔ کیونکہ اس کا جتنا پرچار ہوسکتا تھا اتنا ریشمی کپڑے کا نہیں۔ ایک تو سب لوگ ریشمی کپڑا لے نہیں سکتے تھے، اور اگر لینا چاہتے تو اتنا پیدا نہیں ہوسکتا تھا کہ سب کی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا۔ دوسرے یہ ڈر بھی تھا کہ اگر زیادہ دھیان اس طرف دیا گیا تو کپاس کی کھادی غائب ہو جائے گی، اور اس میں جتنی ترقی ہونی چاہئے وہ دھیان بٹ

جانے کی وجہ سے نہیں ہو سکے گی. پھر بھی چونکہ ریشمی کھادی سے بھی غریبوں کی ویسی ھی مدد ہوتی جیسی کپاس کی کھادی سے، اس لئے بہت سی شاخوں نے ریشمی کھادی کی طرف بھی دھیان دیا. اور کافی و اچھی کھادی بھی تیار ہونے لگی. اس سے موٹی کھادی کی بکری میں بھی مدد پہونچی، کیونکہ اکثر گاھکوں کو جب خوبصورت اور اچھے ریشمی اور کپاس کے باریک کپڑے دئے جاتے تو اس کے ساتھ کچھ موٹے کپڑے بھی دئے جاتے.

اسی طرح سے اونی کھادی بھی بنی جانے لگی. اس کے لئے خاص انتظام کشمیر میں کیا گیا، جہاں ابھی تک یہ فن مٹا نہیں ھے. شمالی ھند میں سردی کے دنوں میں اونی کپڑا ضروری ہو جاتا ھے. چرخہ سنگھ نے کھادی پہننے والوں کے لئے اونی کھادی تیار کرا کے اس کو اپنے بھنڈاروں میں بیچنا شروع کر دیا. اس طرح کی کھادی میں خاصی ترقی ہوئی اور اس کی بکری بھی بڑھ گئی. دوسری قسم کی کھادی کے سوا مل کے بنے ہوئے کپڑے کے ساتھ، اپنی خوبی اور قیمت میں، اونی کھادی بھی بہت حد تک مقابلہ کرتی تھی، اس لئے اسکی مانگ ھمیشہ قائم

رھتی. جس طرح کپاس کی کھادی کی بکری بڑھانے کے لئے خاص تدبیر کرنی پڑتی اس طرح اونی کھادی کے لئے کسی تدبیر کی ضرورت نہیں ھوتی.

کھادی کے علاوہ مہاتماجی اچھوت پن دور کرنے پر بھی زور دے رھے تھے. اس کے متعلق بھی کانگریسی لوگ پرچار کیا کرتے. ھریجن بستیوں میں جانا، ان کے کام میں مدد دینی، نجی طریقہ سے چھوت چھات نہ ماننے اور اسکے ساتھ ھی اس بات کی بھی تدبیر کرنی کہ ان کے لئے جن مندروں میں جانا منع تھا وہ ان کے لئے کھلوانا. یہ باتیں سبھی جگہ ھو رھی تھیں، لیکن اس کام میں اتنا زور نہیں آیا تھا اور نہ اتنا رواج ھوا تھا جتنا کچھ دنوں کے بعد ھوا. لیکن اس کے لئے بھی فضا تیار ھو رھی تھی. مہاتماجی جو کام خود نہیں کرتے تھے وہ کسی سے اسکو کرنے کیلئے بھی نہیں کہتے تھے. وہ ایك لڑکی کو اپنی لڑکی بنا کر اس کو سابرمتی آشرم میں رکھے تھے، وھاں جو بڑھی اور پلی. جب تك اس کی شادی نہیں ھوئی وہ مہاتماجی اور «با» کے ساتھ ھی رھی. مہاتماجی کے چار لڑکے تھے اور لڑکی ایك بھی نہیں تھی، اس لئے وہ اچھوت لڑکی ھی ان کی لڑکی بن گئی.

یہ اچھوت پن معلوم نہیں کب سے ھندو سماج میں آ گیا تھا. الگ الگ مقاموں میں اس کی الگ الگ شکل ھو گئی تھی. اسکی ایک شکل تو یہ ھے جو بہت کچھ آج بھی موجود ھے. لیکن اب آھستہ آھستہ زور کم پڑتا جا رھا ھے، اس کی یہ سب سے کمزور شکل کہی جاسکتی ھے. یا اس میں ایک ذات کے لوگ دوسری ذات کے ساتھ کھانے پینے کا بیوھار نہیں کرتے، یعنی ان کے ساتھ بیٹھکر کھانا نہیں کھاتے اور آپس میں شادی بیاہ بھی نہیں کرتے. اس کی بھی بہت شاخیں در شاخیں ھوگئیں ھیں. صرف برھمن، کھتری، شودر، ویش یہی چار قسمیں نہیں ھیں بلکہ ان میں سے ھر ایک کی بہت سی قسمیں بن گئی ھیں. کچھ تو دیس کے وجہ سے اور کچھ دوسری وجوھات کی بنا پر اتنی بہت سی قسموں کا دوسری قسموں سے کھانے پینے کا تعلق نہیں ھوتا. ایک قسم کے اندر بھی بہت سی شاخیں ھوگئی ھیں. ایک ذات کا دوسری ذات کے ساتھ تو کوئی تعلق ھوتا ھی نہیں. شودروں کے ساتھ تو دوسری تین ذاتوں کا کوئی تعلق ھوسکتا ھی نہیں. اسی طرح شودروں میں بھی بہت سی ذاتیں ھوگئی ھیں جن کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق نہیں ھوتا. کچھ ذاتوں کیساتھ

تعلق تو ہوسکتا ھے لیکن ان کے ساتھ جسم کا چھو جانا منع نہیں ھے. بعض کا چھوا ھوا پانی استعمال کیا جاسکتا ھے لیکن پکائی ھوئی چیز نہیں. پکائے ھوئے اناج میں بھی کچی پکی رسوئی کا فرق مانا جاتا ھے. لیکن ان چاروں ذاتوں کے علاوہ ایك پانچویں ذات بھی ھے، جس کا جسم اگر چھو جائے تو جسم کو پاك کرنے کے لئے غسل وغیرہ کا قانون ھے. اس طرح کا اچھوت پن اتنی دور تك چلا گیا ھے کہ اچھوت سے کسی لکڑی یا رسی کے ذریعہ سے بھی چھو جانا برا مانا جاتا ھے. کہیں کہیں، خاصکر دکن میں تو دیکھنا بھی چھو جانے کے برابر ہوتا ھے. وھاں اچھوت لوگوں کا بعض راستوں سے چلنا بھی منع ھے. مندروں کے اندر تو ان کا جانا ناممکن ھے.

مہاتماجی نے اس قسم کے برے اچھوت پن کو ھی دور کرنے کی تدبیر کی. کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ ھو جائے تو ذاتوں کے درمیان کھانا پینا اور شادی بیاہ پر جو پابندی ھے وہ خود آھستہ آھستہ ختم ھو جائے گی، وہ غیر ملکوں میں بہت رہ آئے تھے اس لئے کھانے پینے میں کسی قسم کی چھوت چھات نہ ماننا ان کی فطرت ھوگئی. لیکن یہ بات اس ملك کے لوگوں،

خاصکر گاؤں والوں کے لئے نئی چیز تھی. جیسا میں اوپر بتا آیا ہوں، ان کے ماحول میں رہنے والے لوگ اس بندھن کو بھی ڈھیلا کر ہی دیتے تھے. چمپارن میں ہم لوگ، جو اس وقت تک اپنی ذات ہی کے اندر کھانا پینا کیا کرتے تھے، اس بندھن کو ہٹا کر سب ایک دوسرے کیساتھ کھانے لگے. یہ کھانا پینا صرف اونچی ذات والے لوگوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ایسے لوگوں کے ساتھ بھی شروع ہوگیا تھا جن کا چھوا ہوا پانی ہم نہیں پی سکتے تھے. خوبی یہ تھی کہ ہم نے یہ کام کچھ چھپا کر نہیں کیا تھا بلکہ کھلے بندوں کیا تھا. ہم لوگ وہاں چاروں طرف کے گاؤں سے آئے ہوئے کسانوں سے گھرے رہتے اور انکی موجودگی میں کھانا پینا کرتے تھے. ان میں سے کچھ کو ہم سب کا ایک ساتھ کھانا شاید پسند نہ آتا ہو. لیکن کسی نے اسکی اعلانیہ مخالفت نہیں کی اور نہ اس پر اعتراض ہی ہمارے سننے میں آیا. لوگوں نے شاید یہ مان لیا کہ یہ سادھوؤں کی ایک جماعت ہے جس میں سب لوگ ایک ساتھ بیٹھکر کھا لیتے ہیں.

«گیا» کانگریس میں جو والنٹیر کام کرنے آئے تھے ان میں سے زیادہ تر گاؤں کے ہی لوگ تھے. وہ اپنے ساتھ کھانے پینے

کے سبھی بندھنوں کو لائے تھے۔ وہ ایسا انتظام چاہتے تھے جس میں ان کو اپنی ذات کے طریقوں کو نہ توڑنا پڑے۔ اسلئے شروع میں ان کے لئے برھمن کھانے پکانے والوں کا انتظام کرنا پڑا۔ ان رضاکاروں کی تعداد بہت تھی، اسلئے ان لوگوں کے لئے اتنے کھانا پکانے والے کھانا تو پکا سکتے تھے لیکن سب کو پروس (کھلا) نہیں سکتے تھے۔ ایک دو بار کھانے کے بعد ھی چند رضاکاروں نے دیکھ لیا کہ اس سے کام نہیں چلیگا۔ انھوں نے آپس ھی میں رسوئی پروسنی شروع کردی۔ ایک دو دن صرف برھمنوں نے پروسا (کھلایا) تھا۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو دوسری ذات کے لوگ بھی کھلانے (پروسنے) لگے۔ دو ھی تین دن کے اندر سب بندھن ٹوٹ گئے، سب کے سب ایک دوسرے کا چھوا ھوا «دال بھات» کھانے لگے۔ اس کے بعد جہاں کہیں کانگریس والوں کی سبھا ھوتی، بہار میں ذات پات کا فرق کرکے کھانے کا انتظام نہیں ھوتا تھا۔ سب ایک ساتھ کھاتے تھے۔

جب مہاتماجی نے اچھوت پن دور کرنے کی تحریک اٹھائی تو کانگریس کے جلسوں میں، ایک ساتھ سب کا بیٹھنا تو ھوتا ھی تھا، ایک ساتھ سب کا کھانا بھی ھونے لگا۔ تھوڑے ھی دنوں

میں کانگریس کے لوگوں میں کھانے پینے کا فرق بھی دور ہو گیا. اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اچھوت پن دور ہو گیا ھے. ابھی تک وہ پوری طرح گیا نہیں ھے. اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دنوں ھی میں اس کا بندھن ڈھیلا پڑنے لگ گیا تھا، پھر آہستہ آہستہ زیادہ سے زیادہ ڈھیلا ہوتا گیا.

مہاتماجی نے ایک ذات کا دوسری ذات کے لوگوں کے ساتھ بیاہ کے قانون میں بھی تبدیلی کردی. خود تو پیدائشی ویش تھے، لیکن ان کے صاحبزادے شری دیو داس گاندھی کی شادی اونچی ذات کے برھمن شری راجگوپال اچاری کی صاحبزادی لکشمی کے ساتھ ہوئی. اس طرح کی اور بھی بہت سی شادیاں ہوئیں. کچھ دنوں کے بعد تو انھوں نے ھریجنوں کے ساتھ بھی بیاہ شادی کرنے پر زور دینا شروع کیا. اپنے آخری دنوں میں تو انھوں نے اپنا ایک اصول سا بنا لیا تھا کہ اسی شادی کی تقریب میں شریک ہوسکیں گے جس میں ایک طرف اونچی ذات اور دوسری طرف ھریجن ہوں. یوں تو وہ شادی کی تقریبوں میں شاید ھی کہیں آتے جاتے تھے، لیکن آشرم کے رھنے والوں یا انکے رشتہ داروں میں کسی کا جب بیاہ ھوا کرتا تو اس میں شریک ھوا کرتے

تھے. ان بیاھوں میں صرف ذات پات کا بندھن ھی نہیں ٹوٹتا بلکہ بیاہ کے طریقے اور ریت بھی بہت بدل دی جاتی.

ھمارے سماج کی شادیوں میں بہت دھوم دھام ھوا کرتی ھے اور پیسے بھی بہت خرچ ھوتے ھیں. بیاہ کے طریقے میں بہت زیادہ سنسکرت کے منتر ھی استعمال میں لائے جاتے ھیں، جن کے مطلب کو دولہا اور دلہن سمجھتے ھی نہیں، بغیر سمجھے وہ پنڈت کے کہنے پر ان کو دھرا دیتے ھیں. مہاتماجی نے منتروں کا مطلب مادری زبان میں بتا دینے کا طریقہ جاری کیا اور منتروں کے بھی غیر ضروری حصوں کو چھوڑ کر ان کو بہت مختصر کر دیا. برات، جلوس کھانا وغیرہ سب کچھ اٹھا دیا. سارا کام چند منٹوں کے اندر ھی ختم کر دیا جاتا، جس میں خرچ نہ ھونے کے برابر ھوتا. اگرچہ آج بھی شادیوں میں پرانا طریقہ بہت کافی جاری ھے، لیکن پھر بھی اس میں شک نہیں کہ تمام جگہوں پر کسی نہ کسی شکل میں سدھار ھونے لگا ھے. اس طرح ذات اور سماج کی حالت میں بھی مہاتماجی نے تغیر پیدا کر دیا. اس کا اثر بہت دور تک پہنچا ھے، لیکن پھر بھی کافی دور تک نہیں گیا.

مہاتماجی کا خیال بیواؤں کے بیاہ کے متعلق ظاھر نہیں ھوا تھا، کیونکہ اس کا کبھی شاید موقع ھی نہیں آیا تھا. ایک واقعہ بہار کے سفر میں پیش آیا، جہاں ان کے خیالات ظاھر ھو گئے. شہر

آرہ کے نزدیک جینیوں کا ایک بیوہ آشرم ہے، جہاں جینی بیوائیں رہتی ہیں. وہاں ان کی تعلیم وغیرہ کا بھی انتظام کیا جاتا ہے. مہاتماجی جہاں کہیں جاتے تھے ان کو سبھی لوگ پبلک اداروں میں لے جانے کی کوشش کرتے تھے. سب اداروں کو تو وہ نہیں دیکھ سکتے تھے، لیکن اس ادارے میں وہ گئے. وہاں دس گیارہ سال کی ایک بیوہ بچی سلام کرنے آئی. اس کو دیکھ کر انھوں نے پوچھا، کیا یہ بھی بیوہ ہے؟ جب ان سے کہا گیا کہ یہ بھی بیوہ ہے اور اس کو اسی حالت میں اپنی ساری زندگی گزارنی پڑے گی، تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے. صرف اس کے بعد انھوں نے صاف صاف لکھا کہ بیواؤں کو زبردستی بیوہ رکھنا ٹھیک نہیں، جو شادی کرنا چاہیں ان کی شادی ہونے دینی چاہئے. کچھ دنوں کے بعد تو انھوں نے اور بھی زیادہ زور دیا اور کہا کہ کوئی رنڈوا اگر شادی کرنا چاہے تو اس کو بیوہ ھی کے ساتھ کرنی چاہئے. اگرچہ اب بھی زیادہ تر بیواؤں کی شادیاں نہیں ہوتی تھیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اب عقد بیوہ اتنا برا نہیں مانا جاتا جتنا اسکے پہلے سماج مانا کرتی تھی.

مہاتماجی نے بہار میں جا کر پردہ سسٹم کو خوفناک شکل میں دیکھا. گجرات اور دکھن میں پردہ بہت کم ہے. میرا خیال ہے

کہ بہار میں جتنا سخت پردہ ھے اتنا شاید کسی دوسرے صوبہ میں نہیں ھے۔ چمپارن میں جب «با» پہونچیں اور کچھ دنوں کے بعد پاٹھ شالاؤں کے کھلنے پر گجرات اور مہاراشٹر کی کچھ عورتیں بھی آئیں، جو پھر پھر کر کام کرنے لگیں خاصکر عورتوں میں، اسی سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ «گیا» کانگریس کے وقت عورتوں کے لئے خاص جگہ بنائی گئی تھی، جہاں پردہ میں رہ کر وہ سبلوگوں کو دیکھ اور سب تقریروں کو سن سکتی تھیں۔ باھر کے نمایندوں کے ساتھ بہت سی عورتیں آئی تھیں۔ پہلے دن تو شہر اور باھر کی سب عورتیں پردہ کے اندر ھی بیٹھیں۔ ان عورتوں کے لئے جو پردہ کے باھر بیٹھنا چاھتی تھیں ایک خاص جگہ مقرر کر دی گئی، وھاں بہت تھوڑی عورتیں پہلے دن بیٹھیں، جن میں بیشتر دکھن سے آئی ھوئی تھیں۔ لیکن آھستہ آھستہ کچھ پردے والی عورتیں بھی ھمت کرکے وھاں آ کر بیٹھ گئیں۔ دوسرے تیسرے دن تو یہ ھوا کہ پردہ والی جگہ بالکل خالی ھوگئی اور کھلی جگہ بالکل بھر گئی۔

ھم نے دیکھا کہ ھمارے یہاں کی عورتیں ان لوگوں ھی سے پردہ رکھتی ھیں جنکو وہ پہچانتی ھیں یا جو ان کے گھر والوں کو جانتے ھیں، یا جن کے متعلق ان کو یہ خدشہ رھتا ھے کہ شاید یہ انہیں

پہچان لیں. اسی وجہ سے میلے یا گنگا اشنان کے وقت تقریباً سبھی گھروں کی عورتیں جاتی ہیں، کیونکہ وہاں بھیڑ میں کسی کو جاننے پہچاننے کا موقع کم ملتا ہے. اس اصول کی بناء پر پہلے دن «گیا» میں سبکی سب پردہ میں بیٹھیں، لیکن جب وہ جان گئیں کہ بھیڑ کافی ہے اور پہچاننے جانے کا گمان کم ہے تو بے دھڑک کھلی جگہوں میں آکر بیٹھ گئیں.

مہاتماجی جہاں کہیں جاتے وہاں عورتوں کا جلسہ الگ کیا جاتا. کیونکہ پبلک جلسہ میں وہ آنا نہیں چاہتی تھیں یا علاحدہ جلسہ میں مہاتماجی کا درشن ان کو آسانی سے ہوسکتا تھا. ان سے عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں، اس لئے چاہے وہ کانگریس کے کام سے یا چرخہ سنگھ کے لئے چندہ جمع کرنے جاتے، وہاں عورتوں کا جلسہ ہوتا، عورتیں اپنے گہنے اتار اتار کر دیتیں. اسطرح سے بہت سا زیور جمع ہوجاتا، جو بعد میں بیچ دیا جاتا، بہار میں کچھ دنوں کے بعد بابو برجکشور پرشاد کی صدارت میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا، جسکا مقصد پردہ توڑنا تھا. وہ انجمن کچھ دنوں تک کام کرتی رہی. اب تو کوئی بھی جلسہ ہو اس میں عورتیں کی تعداد کافی ہوتی ہے. اگرچہ ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ گجرات، مہاراشٹر یا دکھن کے صوبوں کی طرح بہار میں بھی پردہ اٹھ گیا

ہے. پھر بھی بہت کچھ کم ضرور ہو گیا ہے. اگر کوئی عورت ہمت کر کے پردہ کے باہر آجاتی ہے تو برا نہیں مانا جاتا.

سابرمتی آشرم میں جو عورتیں آئی تھیں ان کو ہر طرح کی آزادی تھی، ویسی ہی جیسی کہ مردوں کو، آشرم میں کسی بات پر رائے لی جاتی تو وہ عورتیں بھی اسی طرح آزادی کے ساتھ رائے دیتیں جیسے کہ مرد. وہ کام بھی ایسے ہی کرتیں جیسے مرد. ان دنوں خاصکر چرخہ کا کام ہوتا تھا، اس میں وہ پورا حصہ لیتیں. اس طرح عورتوں میں مہاتماجی نے ایک عجیب بیداری پیدا کردی. اسکے بعد جب کہیں ستیہ گرہ کا موقع آیا، عورتوں نے اس میں پوری بے خوفی سے ویسا ہی حصہ لیا جیسا کہ مردوں نے لیا. «باردولی» کی ستیہ گرہ میں عورتوں نے بہت بڑا حصہ لیا. انھوں نے اپنی منتظمی طاقت کا بھی ثبوت دیا، اس ملک میں صبر و تحمل عورتوں کا مذھبی فریضہ سا بن گیا ہے، اسلئے ستیہ گرہ کی مصیبتوں کو سہ لینا انکے لئے مردوں سے بھی زیادہ قدرتی تھا. سنہ ۱۹۳۰ع میں جب مہاتماجی نے کل ھند ستیہ گرہ شروع کی اسوقت انھوں نے خاصکر شراب بندی کا کام عورتوں کے ذمہ کیا. یہ کام مشکل تھا اور خطرے سے خالی نہیں تھا. کیونکہ اس میں نشہ بازوں سے مقابلہ ہوتا. جس میں بہت سے لوگ بد اطوار ہوتے ھیں، یعنی ھوش و حواس تو شاید ھی کسی

میں ہوتے ہوں. اسلئے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کب اور کیا کر بیٹھے. لیکن اس کام کو بہت ھی بے کالی سے بہت سی عورتوں نے کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شراب کی دکانیں بند ہوگئیں، گاھکوں کی کمی سے بیشتر دوکانداروں کی بکری بھی کم ہوگئی، کچھ شرابیوں نے تو شراب پینی بھی چھوڑ دی. لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنے لوگ ایسے ہونگے جو اس طرح سدھر گئے ہونگے.

سنہ ۱۹۳۰ع کا ذکر ہے کہ بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ میں بھی عورتوں کو بہت جگہوں پر مدد دینی پڑی. اسوقت یہ کوشش تھی کہ بدیشی کپڑے کی بکری بند ہوجائے اور اسکا آنا بھی بند ہو جائے. جو بدیشی کپڑا ملك میں موجود تھا، اگر اسکی بکری رك جائے تو بیوپاری غیر ملك سے کپڑا نہیں منگائیں گے. لیکن اسکی فروخت اگر جاری رھی تو باھر سے اسکا آنا بھی نہیں رکے گا. اسلئے یہ سوچا گیا کہ بدیشی کپڑا جس قدر بھی دوکانوں میں ہے وہ گانٹھوں میں بندھوا کر رکھوا دیا جائے. کچھ تاجر تو خوشی سے راضی ہوگئے اور انھوں نے خود اپنے مال کو گانٹھوں میں بندھوا کر کانگریس کی مہر لگوا دی. یہ سوچا گیا تھا کہ جب یہ کام پورا ھوجائے گا اور کپڑے کی بکری رك جائے گی اسوقت ان گانٹھوں کو کسی دوسرے ملك میں بھیج کر کپڑا بیچ دیا جائے گا

تاکہ بیوپاریوں کا بھی نقصان نہ ہو.

بہار میں عورتوں نے بدیشی کپڑے کی دوکانوں پر پہرہ دینے کا کام کیا. جس دوکان پر بدیشی کپڑا ہوتا اسکے سامنے دو ایک عورتیں جا کر کھڑی ہو جاتیں، اگر کوئی گاھك آتا تو انہیں دیکھتے ھی واپس چلا جاتا. دوکاندار بھی بہت شرمندہ ہوتے اور ان عورتوں کو خاطر مدارات کے ساتھ بٹھاتے، ان کے ساتھ اچھی طرح سے اچھا سلوك کرتے. چند روز کے اندر ھی بہار کے سارے کپڑے کی منڈیوں میں بدیشی کپڑے کی گانٹھیں بندھ گئیں اور ان پر کانگریس کی مہر بھی لگ گئی. یہ زیادہ تر عورتوں ھی کے وجہ سے ھوا. جو دوکانوں پر پہرہ دیتیں، ان میں ایسی بھی تھیں جو پردہ سے باھر کبھی نہیں نکلیں تھیں اور جنہوں نے اس قسم کا کام کبھی نہیں کیا تھا. ان سے کہہ دیا جاتا کہ اگر کوئی خریدار آئے تو اس کے سامنے ھاتھ جوڑ کر کھڑی ھوجانا اور کہنا کہ «آپ بدیشی کپڑے نہ خریدیں اور آزادی حاصل کرنے میں مدد کریں. مہاتماجی کا حکم مانیں». جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے کہ بہت سے گاھك ان کو کھڑی دیکھ کر ھی واپس لوٹ جاتے. کچھ لوگ کہنے پر واپس جاتے اور تھوڑے ایسے بھی ہوتے جو کہنے کے بعد بھی ضد کرتے. دوکانداروں کی بھی مدد شامل تھی. لیکن انھوں نے بھی یہ دیکھ لیا

کہ جب تک عورتیں کھڑی رہینگی اسوقت تک دوکان کھولے رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ھے، کیونکہ بکری ہوتی نہیں صرف بدنامی ھی ہوتی ھے.

ایک دن کا ذکر ھے کہ ایک خاتون ایک دوکان پر پہرہ دینے لگیں. وہ اپنے گھر سے کبھی باہر نہیں نکلی تھیں، اسلئے ان کو معلوم ھی نہیں تھا کہ دوکان سے انکا گھر کس طرف اور کس محلہ میں ھے، جو عورتیں پہرہ دینے میں شریک ہونا چاھتیں ان کو کانگریسی کارکن ان کے گھر سے پیدل یا سواری پر دوکان تک پہنچا دیتے. پھر شام کے بعد جب کام ختم ہوتا تو ان کے گھر واپس پہنچا دیتے. اس روز غلطی سے اس لڑکی کو وہ گھر پہنچانا بھول گئے. لڑکی بیچاری وھیں کھڑی رھی. اتفاق سے ایک مہربان اپنی بیوی کو واپس لیجانے کے لئے اپنی موٹر کار پر جارھے تھے. ان لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ لڑکی اب تک کیوں کھڑی ھے. انھوں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ اسے گھر پہنچانے کے لئے ابھی تک کوئی نہیں آیا. وہ سمجھ گئے کہ یہ غلطی سے ہوا. اس لئے انھوں نے اس لڑکی کو اپنی گاڑی پر بٹھلا لیا. لیکن یہ مشکل پیش آئی کہ وہ اپنے گھر کا پتہ نہیں بتا سکتی تھی، اسے پہونچاتے تو کہاں پہونچاتے. جس سڑک پر لے جاتے تھے تو وہ کہتی اس طرف اس کا گھر ھے. لیکن جس مکان کے سامنے وہ رک جاتے تھے وہ کہتی تھی کہ یہ مکان میرا

نہیں ھے۔ بہار میں رواج ھے کہ بیویاں اپنے خاوندوں کا نام نہیں لیتی ھیں. اسلئے وہ اپنے خاوند کا نام بھی نہیں بتا سکتی تھی، بڑی مشکل سے اپنے خاوند کا نام اس نے کاغذ پر لکھ کردیا. اس وقت انھوں نے تلاش کرکے اسے اس کے گھر پہونچایا.

اس طرح بڑے بڑے گھروں کی عورتیں اس کام میں لگیں. اسلئے یہ کام بہت تیزی کے ساتھ پورا ھوا. خریداری رکتے ھی باھر سے کپڑے کی آمد بند ھوگئی. اس سال کپڑے کی درآمد کے لئے ھندوستان اور باھر کے دوکانداروں میں جو معاھدے ھوا کرتے تھے وہ نہیں ھوئے. اس کا اثر ھندوستان ھی پر نہیں بلکہ دوسرے ملکوں پر بھی جن میں سب سے بڑا انگلستان تھا کافی پڑا.

سنہ ۱۹۲۴ع سے سنہ ۱۹۲۸ع تک کا زمانہ ایک طرح بہت اہم تھا. کیونکہ اس درمیان میں مہاتماجی نے اپنی پوری طاقت تعمیری پروگرام کے چلانے میں صرف کردی. سیاسی میدان سے ایک طرح سے الگ رھے. سوراج پارٹی ھی کانگریس کی طرف سے سیاسی کام کرتی رھی. مہاتماجی کانگریس کے جلسوں میں اور آل انڈیا کمیٹی کے جلسوں میں جاتے تھے. جہاں مناسب سمجھتے وھاں اپنی رائے بھی دیدیا کرتے تھے، لیکن آخری فیصلہ سوراج پارٹی ھی پر چھوڑ دیا کرتے تھے. پنڈت موتی لال جی سارے بڑے،

اہم معاملات پر مہاتماجی کی رائے ضرور لیا کرتے تھے، اس طرح جو تلخی کونسل میں داخلہ کے متعلق پیدا ہوگئی تھی وہ دور ہوگئی۔ کیونکہ دونوں طرف لوگ صاف دلی سے کام کررہے تھے۔

سنہ ۱۹۲٦ع میں اسمبلی میں چناؤ ہوا. اسکے بعد سوراج پارٹی، چناؤ میں بہت زیادہ کامیاب ہونے کی وجہ سے کچھ اور زیادہ کام کرسکی. لیکن آپس میں پھوٹ بھی پیدا ہوگئی. سنہ ۱۹۲۰ع کے دستور میں ایک دفعہ تھی، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ دس برس تک دستور کے اعتبار سے کام ہونے کے بعد پارلیمنٹ ایک کمیشن مقرر کریگی. جو اس بات کی جانچ کرے گا کہ دستور کس طرح کام میں لایا جائے اور آگے کے لئے کیا آئینی اصلاحات کی جاسکتی تھیں. مرکزی اسمبلی میں سوراج پارٹی کی ایک بڑی تجویز یہ تھی کہ برٹش گورنمنٹ کو دس سال تک نہ ٹال کر اور ایک کمیشن نہ مقرر کرکے اپنے نمائندوں اور ہندوستان کے نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس کرنی چاہئے، جو آئینی اصلاحات کے متعلق سمجھوتے کی شکل میں فیصلہ کرے. سنہ ۱۹۲۷ع میں جب مدراس میں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں کانگریس ہوئی تو اس نے ایک کمیٹی بنائی. جس کے ذمہ یہ کام سونپا گیا کہ دوسرے مکتب خیال کے لوگوں کے ساتھ مل کر ایک دستور تیار کرے. اس کمیٹی نے آئندہ چل کر

پنڈت موتی لال جی کی صدارت میں دوسری جماعت کے لوگوں کے ساتھ مل کر ایک دستور کا خاکہ تیار کیا۔ وہی « نہرو کمیٹی رپورٹ» کے نام سے مشہور ہوا۔ ادھر برٹش گورنمنٹ نے بھی اعلان کردیا کہ اس نے سنہ ۱۹۲۰ع کے دستور کے اعتبار سے ایک کمیشن زیر صدارت «سر جونس سائمن» مقرر کردیا ھے۔ اس کمیشن میں ایک ہندوستانی نہیں تھا۔ اس لئے ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں، خواہ وہ کسی جماعت سے متعلق تھے، بہت رنج اور غصہ پیدا ہوا۔ سب نے برٹش گورنمنٹ کی اس کاروائی کی صرف مذمت ھی نہیں کی بلکہ سب کے سب یہ بھی سوچنے لگے کہ اس کے مقابلہ میں کچھ کرنا چاھئے۔ اعتدال پسند اور لیبرل پارٹی کے لوگوں نے کانگریس سے الگ ہوکر سنہ ۱۹۲۰ع کے دستور کے مطابق وزارتوں میں حصہ لیا تھا۔ چناؤ میں کانگریس کے حصہ نہ لینے کی وجہ سے ان کیلئے سنہ ۱۹۲۰ع کے چناؤ میں راستہ صاف تھا۔ سنہ ۱۹۲۳ع میں بھی ایک طرح سے انہیں کھلا میدان مل گیا تھا۔ ان میں سے بڑے بڑے لوگ، جیسے بنگال میں شری سریندر ناتھ بنرجی، صوبۂ متحدہ میں چنتامن وغیرہ وزارتوں میں شریک ہوئے تھے۔ لیکن آخر میں ان کو بھی تجربہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ شروع میں جب نان کواپریشن کا زور تھا اس وقت اعتدال پسند

لوگوں کی کافی خاطرداری ہوئی تھی . لیکن جب تعاون کمزور ہوگیا اسوقت پھرانکی بھی پوچھ کم ہوگئی تھی . یہانتك كه شری چنتامن کو استعفاء دیکر ھٹ جانا پڑا . اس لئے اس جماعت کے لوگ بھی پہلے سے ھی کچھ غیر مطمئن تھے . جب سائمن کمیشن کے ممبروں کے ناموں کا اعلان کیا گیا ، اور جب اس میں ایك بھی ھندوستانی کا نام نہیں پایا گیا تو غیر اطمینانی اور بھی بڑھ گئی . سنه ۱۹۲۸ ع میں ایك طرف تو نہرو کمیٹی دستور بنانے میں لگ گئی اور اس کام میں اس کو سبھی جماعت کے لوگوں کی طرف سے امداد ملی ، اور دوسری طرف یه سوچا جانے لگا که ھندوستان کے ساتھ جو یه بے انصافی اور اسکی بے عزتی سائمن کمیشن کے تقرر کی شکل میں کی گئی ھے اس کا کسطرح سے مقابله کیا جائے . بہت سے مقاموں پر جلسے ھوئے ، جس میں کانگریس ، لیبرل پارٹی ، خلافت کمیٹی اور دوسرے سبھی خیال کے لوگ شریك ھوئے . سب نے مل کر اس کمیشن کے تقرر کی مذمت کی . مجھے یاد ھے که جب پٹنه میں جلسه ھوا تو اس میں بہت دنوں کے بعد کانگریس کے لوگ سر علی امام جیسے دوسری جماعتوں کے لوگ بھی شریك ھوئے تھے . اس میں به اتفاق رائے مذمت کے ریزولیوشن پاس کئے گئے تھے . ھم لوگوں کو اس بات سے بڑی خوشی حاصل ھوئی تھی که اب تك

جو لوگ ہم سے الگ تھے، پھر ایک ساتھ مل کر برٹش گورنمنٹ کا مقابلہ کریں گے. ہم یہ جانتے تھے کہ نان کواپریشن اور ستیہ گرہ کے پروگرام کو وہ لوگ نہیں مانیں گے، لیکن یہ ظاہر تھا کہ اگر ہم لوگ ان سے آگے بڑھکر کچھ اپنی طرف سے کریں گے تو وہ اسکی مخالفت نہیں کریں گے. اس طرح ایک نئی فضا پیدا ہو گئی.

مہاتماجی جس چیز کی توقع کر رہے تھے وہ نزدیک آتی دکھائی دی. ۱۹۲۸ توقع اور تیاری کا سال رہا. توقع اس بات کی کہ دیکھیں ہم سب مل کر اس مقابلہ کیلئے کیا پروگرام بنا سکتے ہیں، اور تیاری اس بات کی کہ ہم سب مل کر اپنی طرف سے ایک دستور کرلیں جس کو منظور کرنے کے لئے کمیشن کو مجبور کیا جاسکے. دستور کی تیاری میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہندو مسلم جھگڑوں اور دوسری بہت سی ذاتوں میں اعتماد اور بھروسہ پیدا کرنے کے لئے، دستور میں کیا کیا باتیں رکھی جائیں جس سے وہ مطمئن ہو سکیں. نہرو کمیٹی اس کوشش میں بہت کامیاب ہوئی. کچھ باتیں ایسی بھی رہی گئی تھیں جن پر سمجھوتہ نہ ہوسکا. پھر بھی امید کی جاتی تھی کہ جب کمیٹی کی رپورٹ سب جماعتوں کے نمایندوں کی کانفرنس میں پیش کی جائیگی تو ان معاملات پر کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ہو جائیگا.

ملک میں نئی بیداری ہو چکی تھی. اس کی سب سے بڑی علامت

باردولی ستیہ گرہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اوپر کہا جاچکا ھے کہ سنہ ۱۹۲۱ع کے آخر اور سنہ ۱۹۲۲ع کے شروع میں مہاتماجی نے باردولی ھی کو سوراج کے لئے ستیہ گرہ کی اجازت دی تھی اور خود اس ستیہ گرہ کی لیڈری کرنے کو تیار تھے۔ یہاں تک کہ وائسرائے کو خط بھی لکھے۔ لیکن «چوری چورا» کے حادثہ کی وجہ سے اسے روك دینا پڑا۔ سنہ ۱۹۲۸ع میں فصل خراب ہو جانے اور مالگزاری کی معافی نہ ملنے کی وجہ سے «باردولی» تعلقہ کے لوگوں میں اختلاف ہو گیا۔ جب گورنمنٹ نے ان کا مطالبہ پورا نہیں کیا تو وھاں کے لوگوں نے ارادہ کیا کہ ستیہ گرہ کی جائے اور مالگزاری نہ دی جائے۔ سردار ولبھ بھائی نے بڑی مضبوطی اور ہوشیاری کے ساتھ ستیہ گرہ کی لیڈری کی۔ گورنمنٹ کی طرف سے جتنا زور لگایا جاسکتا تھا لگایا گیا۔ لیکن وہ کچھ نہ کرسکی اور آخر میں اسے سمجھوتہ کرنا پڑا۔ اس کامیابی کی وجہ سے سارے ملك میں جوش کی لہر امنڈ آئی۔ اب سب لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اگر پوری کوشش کی جائے تو سارے ملك میں «باردولی» جیسی ستیہ گرہ چل سکتی ھے اور کامیابی بھی ہوسکتی ھے۔

اب تك ستیہ گرہ خیال ھی میں رہا کرتی تھی، اتنے بڑے پیمانے پر اس کا استعمال نہیں ہوا تھا۔ یوں تو کھیڑا، بورسد اور ناگپور

میں چھوٹی موٹی ستیہ گرہ پوری طرح کامیاب ہو چکی تھی. لیکن وہاں مقصد دوسرا تھا جن لوگوں کو ان میں حصہ لینا پڑا تھا ان کی تعداد بھی کم تھی. لیکن «باردولی» میں ایک پورے تعلقہ کے لوگوں نے اس میں حصہ لیا اور سب کو بہت تکلیف سہنی پڑی. آس پاس کے لوگ بھی، جن میں ریاست بڑدو کے گاؤں تھے، ان لوگوں کی مدد کرتے رہے. یوں تو سارے ملک کی نظریں «باردولی» کی طرف لگی ہوئی تھیں. اس لئے اس کامیابی نے ثابت کر دیا کہ اگر جنتا اپنی طرف سے ثابت قدم رہے اور کہیں بلوہ فساد نہ کرے تو برٹش گورنمنٹ کو ہار ماننی ہی پڑے گی. کسی باہر والے نے کہا تھا کہ مہاتماجی نے اپنے لوگوں کے ھاتھوں سے ہتھیار چھین کر برٹش گورنمنٹ کا بھی ہتھیار چھین لیا، یعنی اپنے لوگوں کو اہنسا کا پابند کر کے برٹش گورنمنٹ کے تشدد آمیز ہتھیار کو بھی بیکار کر دیا. بات سچی تھی. اگر ہم اس چیز کو پوری طرح سمجھ جاتے تو صرف سوراج ہی ہم کو نہ جلد مل گیا ہوتا، بلکہ ہم میں اور بھی اتنی طاقت پیدا ہوگئی ہوتی کہ ہم ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیشہ تیار رہتے. لیکن وہ ادھورا رہ گیا. ہم نے تو سوراج حاصل کر لیا لیکن اسکی حفاظت کے لئے ہمیں آج اپنی فوج پر بھروسہ کرنا پڑ رہا ہے.

سولھواں باب

سنہ ۱۹۲۸ ع میں کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں ھوا. پنڈت موتی لال نہرو صدر تھے. کانگریس کے ساتھ ساتھ ایک آل پارٹی کانفرنس بھی ھوئی. اسکے سامنے نہرو کمیٹی کی رپورٹ پیش کی گئی. اس کی ضرورت اسلئے اس وقت اور زیادہ ھوگئی تھی کہ ، سائمن کمیشن ، ھندستان پہونچگیا تھا. اس لئے یہ ضروری تھا کہ ھم یہ دکھا سکیں کہ ھندستان کے سبھی لوگ ایک رائے ھوگئے ھیں، اور ان کے مطالبہ کو برٹش گورنمنٹ کو منظور کرنا ھی چاھئے. دو باتوں میں اختلاف تھا. ایک یہ تھی کہ برٹش گورنمنٹ کو چاھئے کہ وہ ھندستان کو مرتبہ نوآبادی (ڈومینین اسٹیٹس) دیدے. اس کے متعلق کانگریس میں بھی دو رائیں تھیں. کچھ لوگوں کا جن میں شری سرینواس آئینگر، پنڈت جواھر لال نہرو، شری سوبھاش چندر بوس وغیرہ تھے، خیال تھا کہ ھم کو پوری آزادی کی بات چیت کرنی چاھئے. برٹش سامراج سے مرتبہ نوآبادی (ڈومینین اسٹیٹس) کے متعلق گفتگو نہیں کرنی چاھئے.

دوسرے لوگ (ڈومینین اسٹیٹس) سے مطمئن ہوجاتے اگر برٹش گورنمنٹ اسے مان لیتی. دوسری بات ایسی تھی جس کے متعلق اختلاف رائے دوسرے فرقوں کے ساتھ تھا. خاص کر ہندو اور مسلمانوں کا اختلاف. اس کانفرنس میں اچھوت طبقه کا کوئی خاص مقام دیکھنے میں نہیں آیا. اور نه ان کی طرف سے کوئی خاص مانگ پیش کی گئی. کانگریسیوں اور سبھی دوسرے ہندوؤں کا خیال تھا که اچھوت لوگ ہندو ہی ہیں. ان کے لئے کسی خاص ادھکار (حق) کی ضرورت نہیں ہے. ہاں سکھ اپنی طرف سے ضرور خاص اختیاروں کے دعویدار تھے.

کانفرنس میں مرتبه نوآبادی (ڈومینین اسٹیٹس) کے متعلق کوئی بڑا اختلاف نہیں ہوا. اگرچه وہاں بھی کامل آزادی کے حامیوں نے یه بات اٹھائی. لیکن یه بات کانفرنس میں فرقه وارانه جھگڑوں کے نذر ہوگئی. زیاده تر فرقه وارانه جھگڑوں ہی کی وجه سے کانفرنس ناکام ہوئی. اب زیاده تر لوگ کانگریس سے جھگڑا طے کرنے کے طرفدار تھے. مسلمانوں کی مانگ بھی کچھ ایسی نہیں تھی که اگر وہ مان

لی جاتی تو دیش کا بہت بڑا نقصان ہوتا. اس وقت شاید یہ کسی نے نہیں سمجھا تھا کہ اس کے نہ ماننے کا نتیجہ ملک کے بٹوارے کی صورت میں ہوگا، جو ہوا. اگر اس وقت مہاتماجی کی باتیں لوگوں نے مان لی ہوتیں تو ملک کی تاریخ شاید دوسری ہوتی. لیکن ہم لوگوں نے یہ نہیں سمجھا تھا کہ برٹش کی فریب کاری اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ہم میں پھوٹ ڈال کر لڑاتی رہے گی. ہم تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ اگر قرین انصاف ہے تو برٹش گورنمنٹ کو اسے ماننا ہی پڑے گا. یعنی ہم لوگوں کو برٹش گورنمنٹ پر بھروسہ تھا. ہم یہ امید کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان وہ انصاف کریں گے.

مسلمان ایک طرح سے کانفرنس کے بعد ہی ایک حد تک کانگریس سے الگ ہوکر اپنی تنظیم کرنے لگے. ان میں سے کچھ تو ایسے تھے-جن میں مسٹر جناح بھی تھے جو کچھ عرصہ تک اس کوشش میں رہے کہ کوئی راستہ نکالا جائے. لیکن کچھ دنوں کے بعد سب لوگوں نے ایک رائے ہوکر آل پارٹی مسلم کانفرنس قائم کردی.

کانگریس کے اندر مرتبہ نوآبادی کے لئے جو اختلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کے بارے میں بھی مہاتما جی نے بہت کوشش کی کہ کوئی سمجھوتہ ہوجائے. لیکن آخر میں یہ طے پایا کہ اگر ایک سال کے اندر برٹش گورنمنٹ مرتبہ نوآبادی دے دے گی تو ہم اسے منظور کرلیں گے، لیکن اگر اس نے اس مانگ کو ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ ع تک منظور نہ کیا تو کانگریس اپنا عقیدہ بدل دے گی جو اس وقت تک حصول سوراج تھا. لفظ سوراج ایسا تھا کہ جس سے دونوں مطلب نکل سکتے تھے یعنی مرتبہ نوآبادی اور کامل آزادی. کیونکہ مرتبۂ نوآبادی میں بھی اپنے کاروبار میں ہر ایک نو آبادی آزاد ھی سمجھی جاتی تھی، اور اس کا مطلب کامل آزادی بھی ہوسکتا تھا. اس لئے اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ سنہ ۱۹۲۹ ع میں اگر ھندستان نوآبادی نہ بنا تو کانگریس اپنے عقیدے اور مقصد کامل آزادی کا اعلان کردے گی پھر اسکے بعد مرتبہ نوآبادی اگر ملے گا بھی تو اسے وہ منظور نہیں کرے گی.

مہاتما جی کا ایک یہ اصول تھا کہ کبھی وہ ایک بات کو

بڑھا کر نہیں کہتے تھے، بلکہ جو کچھ کہتے اسکا ہر ایك لفظ نپا تلا ہوتا اور بڑا مطلب رکھتا تھا خاص کر تجویزوں میں وہ کسی لفظ کو بھی محض زبان کی زیبائش کیلئے استعمال نہیں کرتے تھے. اسلئے جب انہوں نے یہ کہا کہ ایك سال کے اندر اگر مرتبۂ نوآبادی نہ مل جائے تو وہ کامل آزادی کا اعلان کریں گے انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ ع تك یا تو مرتبۂ نوآبادی لےکر رهیں گے نہیں تو کامل آزادی کا اعلان کر هی دینگے. سب لوگوں نے اس سمجھوتے کو مان لیا. یہ سمجھا گیا کہ یہ اتفاق رائے سے منظور ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا. پنڈت جواهرلال نہرو اور شری سری‌نواس آئنگر تو اس سمجھوتے پر قائم رهے لیکن شری سوبھاش‌چندر بوس نے کانگریس کے اجلاس میں اسکی مخالفت کی. اس طرح وہ تجویز اختلاف کے ساتھ پاس ہوئی. مہاتما جی اپنی بات پر قائم رهے. جب ۳۱ ڈسمبر سنہ ۱۹۲۹ع آیا اور هندستان کو مرتبۂ نوآبادی نہ ملا تو کانگریس کے عقیدے کو بدل کر کامل سوراج والی تجویز

انہوں نے لاہور کانگریس میں پیش کی اور وہاں منظور بھی ہوگئی.

سنہ ۱۹۲۹ع کا سال تیاری کا سال رہا. گاندھی جی نے پھر سے کانگریس کی لیڈری پوری طرح اپنے ہاتھہ میں لے لی، کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ کانگریس صرف اپنا عقیدہ بدل کرھی مطمئن نہیں رہے گی بلکہ اسکے حصول کے لئے اسے قدم بھی اٹھانا ھی پڑے گا اب دیش کو اسکے لئے تیار ہوجانا چاھئے. مہاتماجی کی تیاری تو تعمیری کام ھی کے ذریعہ سے ہوتی تھی اسلئے انہوں نے تعمیری کام پر پھر زور دیا. خاصکر کھادی پر جسکے اندر بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ اور اسکی جگہ کھادی کا پرچار بہت بڑا جز تھا. انہوں نے ایکبار بہت سی جگہوں کا دورہ کیا جگہ جگہ بدیشی کپڑوں کی ہولی جلوائی. صوبہ «برھما» سے ان کو دعوت آئی تھی اسلئے وہ وہاں جا رہے تھے راستے میں کلکتہ کے مقام پر ان کو ٹہرنا پڑا تھا. وہاں بھی ایک پبلک میدان میں بدیشی کپڑوں کی ہولی کی گئی. اس کے لئے ان پر مقدمہ چلایا گیا. وہاں کے وکیل اور

بیرسٹروں کا خیال تھا کہ مقدمہ نہیں چل سکتا کیونکہ اس میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا گیا. مہاتما جی نے یہ پہلے سے ھی کہہ رکھا تھا کہ ہم لوگ ابھی ستیہ گرہ کرنا نہیں چاھتے. اسلئے انھوں نے اپنے خیال میں جان بوجھکر کسی قانونی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی. بہر حال مقدمہ پیش ھوا اور اسمیں بیرسٹروں نے پیروی کی، آخر میں مہاتماجی پر ایك روپیہ جرمانہ ھوا جس کو کسی نے داخل کر دیا. مہاتماجی برھما جا کر واپس آ گئے. اور اب سارے دیش میں اس بات کی امید کی جانے لگی کہ دیکھیں اس سال کے آخر تك کیا ھوتا ھے.

دیش میں اس نئی بیداری کا بڑا سبب «سائمن کمیشن» کا تقرر تھا. جب «سائمن کمیشن» ھندستان پہنچا تو سب جماعت کے لوگوں نے مل کر اس کا بائیکاٹ کیا، کانگریس اور کانگریس کے باھر کی سبھی جماعت کے لوگوں نے سوائے چند لوگوں کے اس کے سامنے جانے اور کچھ کہنے سے انکار کردیا. کانگریس کے لوگوں نے اس سے زیادہ یہ کیا کہ جہاں کمیشن پہنچتا وھاں اس کے خلاف بڑا مظاھرہ ھوتا

کالے جھنڈے کے ساتھ یہ کہا جاتا کہ "سائمن واپس جاؤ".
پولیس بھی اپنی طرف سے چپ نہیں رہتی تھی. مظاہرہ
کرنیوالے پر بہت مقامات میں لاٹھیاں بھی چلاتیں، مارپیٹ
کرکے تتر بتر کردیتی. پنجاب میں لالہ لاجپت رائے پر
لاٹھیاں پڑیں جس کا نتیجہ کچھ دنوں کے بعد یہ ہوا کہ وہ
سورگ باش ہو گئے. صوبہ متحدہ میں بھی پنڈت جواہرلال
نہرو وغیرہ کے لاٹھیاں لگیں، اس طرح بہت سے مقامات پر
جہاں جہاں کمیشن گیا بہت سے لوگوں کو مار پیٹ سہنا
پڑی. اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا، کہ بائیکاٹ زبردست اور
کامیاب ہوتا گیا. صرف وہی لوگ جو اس زمانہ میں وزارت
میں شریک تھے کمیشن سے جو کچھ کہنا سننا چاہتے تھے
کہہ سکے. آزادی کے خیال کا کوئی بھی آدمی جس کی بات
ماننے کے لئے جنتا تیار تھی کمیشن کے سامنے نہیں گیا.
مہاتماجی نے کمیشن کے بائیکاٹ کی تائید کی تھی.

بہار میں کوئی واقعہ نہیں ہوا. اس کا کارن یہ تھا کہ وہاں
کا انسپکٹر جنرل پولیس بہت ہوشیار تھا. وہ سمجھ گیا کہ
اور جگہوں کی طرح مارپیٹ کرنے سے صرف بدنامی ہی

ھوگی ، اور کوئی فائدہ نہیں ھوگا. کمیشن کے پہنچنے سے
ایك دن پہلے ھی اس سے میری ملاقات ھوئی تھی. میں
تو یہ جانتا ھی نہیں تھا کہ مجھ سے بھی اسکی ملاقات ھوگی
لیکن اتفاق سے ڈاکٹر سچدانند سنہا کے گھر پر جہاں وہ
پہلے سے میرا انتظار کر رھا تھا میں چلا گیا تھا. اس نے
کہا اور جگہوں پر جیسا ھوا ھے، ویسا پٹنہ میں وہ نہیں
ھونے دینا چاھتا. میرے کہنے پر اس نے مان لیا کہ استقبال
کرنے والوں اور بائیکاٹ کرنے والوں کی آپس میں لڑائی نہ
ھونے دینے کا ایك طریقہ یہ ھونا چاھئے کہ دونوں الگ
الگ رکھے جائیں. میں نے کہا اگرچہ یہ دسمبر کا مہینہ
ھے، اور سردی خوب پڑ رھی ھے. اور جس گاڑی سے
کمیشن پٹنہ میں پہنچے گا، وہ بہت سویرے پہنچنے والی
ھے لیکن کم سے کم بیس ھزار آدمی بائیکاٹ کیلئے اسٹیشن
پر پہنچ ھی گئے. مگر شاید وہ سمجھتا تھا کہ اتنے آدمی
نہیں آئیں گے اس لئے اس نے یہ مان لیا کہ سڑك کے ایك
طرف قریب ھی جو نیا پلیٹ فارم کمیشن ھی کے لئے بنایا
گیا تھا، ادھر ھی استقبال کرنے والے رھیں گے. دوسری

طرف بائیکاٹ کرنے والے۔ ہم تو جانتے تھے کہ استقبال
کرنیوالے بہت کم ہونگے اور بائیکاٹ کرنے والے بہت زیادہ۔
چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک طرف سو دو سو آدمی اور دوسری
طرف تیس چالیس ہزار۔ انسپکٹر جنرل سے پھر وہیں پر
میری ملاقات ہوئی۔ سب باتیں پر امن طریقہ سے ہوجانے
پر اس نے مجھے مبارکباد دی۔ اور مجھ سے کہا کہ میں
نے اس سے جو بیس ہزار آدمیوں کا وعدہ کیا تھا وہ
میں نے پورا کیا کیونکہ اس سے کہیں زیادہ لوگ وہاں پر
پہنچے تھے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۲۹ ع کا سال تیاری
کا سال تھا۔ برٹش گورنمنٹ بھی بالکل چپ نہیں رہی۔
لارڈ ارون جو وائسرائے تھے انگلستان گئے۔ وہاں سے
لوٹ کر انہوں نے اعلان کیا کہ آئینی اصلاحات کے
متعلق برٹش گورنمنٹ کا جو اصول رہا ہے، اس میں
مرتبہ نوآبادی موجود ہے۔ لیکن یہ بات صاف نہیں تھی کہ
اسی سال کے اندر ہندوستان کو نوآبادی کی حیثیت مل
جائیگی۔ اعلان کا مطلب اپنی اپنی سمجھ کے موافق کئی

طرح سے لوگ لگانے لگے. مہاتماجی نے سوچا کہ اس طرح اپنا مطلب لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے. لارڈ ارون ہی سے پوچھ لینا چاہئے. کہ وہ اعلان همکو کہاں تك لیجاتا ہے. ادھر کانگریس کی تاریخ بھی نزدیك آنے لگی. مہاتما جی، پنڈت نہرو اور مسٹر جینا کیسا تھ لارڈ ارون سے ملے. وائسرائے کی ان سے جو باتیں ہوئیں اس سے ظاہر ہو گیا کہ مرتبۂ نوآبادی فوراً دے دینے کا معاملہ نہیں ہے. وہ آہستہ آہستہ ہی ہو سکیگا. اس عرصہ میں کانفرنس وغیرہ کے ذریعہ لوگ مصروف رکھے جائیں گے. مہاتماجی نے ارادہ کرلیا کہ کلکتہ کے فیصلہ کے موافق کامل آزادی کو اپنا عقیدہ بنانے کے سوا کانگریس کے لئے اب کوئی دوسرا راستہ نہیں رہ گیا ہے.

سترھواں باب

میں اسی سال نومبر کے مہینہ میں « برھما » گیا . اور تقریباً دس بارہ روز وھاں رھا . میرے جانے کے دو سبب تھے . ایك یہ کہ میرے دوست جن کے مقدمہ میں میں انگلستان گیا تھا ، جن کی بہت بڑی زمینداری « برھما » میں تھی ، جس کیلئے وہ مقدمہ چلا تھا ان دنوں « برھما » ھی میں تھے . ان کا اصرار یہ تھا کہ میں ایك بار وھاں آؤں . دوسرا سبب یہ تھا کہ وھاں دو تین جگھوں پر جن میں ایك یہ زمینداری بھی تھی ، بہاری کسان بڑی تعداد میں بس گئے . جن میں سے کچھ نے اپنی شکایتیں میرے پاس بھیجی تھیں اور مجھ پر زور دیا تھا کہ میں خود وھاں جا کر سب باتوں کو دیکھ سن لینے کے بعد اگر ھو سکے تو ان کی مدد کروں .

وھاں بہاری کسانوں کے جانے کا ایك خاص سبب یہ ھوا تھا کہ جب انگریزوں نے اتری « برھما » کو انیسویں صدی کے آخر چوتھائی میں جیت کر اپنا راج قائم کیا ، تو انھوں

نے اس بات کی ضرورت سمجھی کہ وہاں جو زمین بالکل غیرآباد پڑی ہے. وہ ہندوستانی کسانوں کو لے جا کر آباد کرائی جائے. زمین بہت تھی. شاید یہ خیال تھا کہ « برھما » کے لوگوں میں ایک اچھی تعداد میں اگر ہندوستانی بسیں گے تو برھما پر قابو رکھنا شاید کچھ آسان ہو جائے. اس لئے ہندوستان میں انھوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ ہندوستان میں زمین کی کمی محسوس ہو رہی ہے، اور برھما میں بہت سی زمین یونہیں پڑی ہوئی ہے، اگر یہاں کے زمیندار یا دوسرے دھنی لوگ وہاں زمین لیکر اور یہاں سے ہندوستانیوں کو لیجا کر زمین آباد کرائیں، تو ان کو کافی منافع ہوگا. اور جو وہاں جا کر بسیں گے، انہیں بھی بہت اچھی اور کافی زمین مل سکے گی، اور اسمیں گورنمنٹ بھی ہر طرح سے مدد کرے گی. اس اعلان پر ہندوستان کے کچھ لوگ وہاں گئے، گورنمنٹ نے ان لوگوں کو زمینیں دیں. کچھ تو وہاں نہیں ٹک سکے اور واپس چلے گئے. مگر کچھ لوگ رہ گئے، ان میں ایک انگریز نیل والا بھی تھا، جس کا نام « ملن » تھا. اس نے وہاں چوبیس ہزار

ایکڑ زمین لی . ضلع شاہ آباد (بہار) کی طرف سے کسانوں کو لے جاکر اس نے وہاں بسایا تھا . کئی لاکھ سالانہ کی آمدنی اس زمینداری سے اسکو ہوئی . اسی طرح سے میرے دوست رائے بہادر ہرہر پرشاد کے باپ رائے بہادر جے پرکاش لال نے بھی ١٤ ہزار ایکڑ زمین لی جسکو ان کے مرنے کے بعد رائے بہادر ہر ہر پرشاد نے آباد کرایا تھا . جس وقت زمین لی گئی تھی اس وقت وہاں گھنا جنگل تھا ، جس میں ھاتھی شیر وغیرہ جنگلی جانور رھا کرتے تھے . بڑی مشکل اور ھمت سے آھستہ آھستہ زمین آباد ھو پائی تھی . جس وقت میں گیا تھا اس وقت آس پاس کہیں جنگل کا نشان تك نہ تھا . وھاں کے رھنے والے گھر بار رھن سھن اور بولی میں سب شاہ آباد ھی کے معلوم ھوتے تھے . وھاں جانے پر ان گاؤں کو دیکھنے اور وھاں کے لوگوں سے ملنے کے بعد یہ نہیں معلوم ھوسکا کہ ھم برھما میں ھیں .

مسٹر ملن کی زمینداری میں کسانوں کو کچھ شکایت نہ تھی . انھوں نے مجھے بلایا تھا کہ میں ان کے معاملات

طے کرادوں ۔ میں ان دونوں وجہوں سے وہاں گیا اور پہلے پہل « برھما » کو دیکھنے کا موقعہ بھی ملا ۔ کسانوں کی طرف سے میں نے « ملن » کے منیجر سے باتیں کیں ۔ ساری شکایتیں تو دور نہیں ہوئیں لیکن ان کو کچھ آسانیاں ضرور ملیں ۔

برھما کے لوگ بہت مذہبی ہوتے ہیں ۔ وہاں بدھ بھکاریوں کی جنکو « پھونگی » کہتے ہیں بڑی عزت ہے ، ان کی ایک بہت بڑی ٹولی « گیا » کانگریس کے وقت « اون اتما » کی لیڈری میں ہندستان آئی تھی ۔ برھما میں جو قومی بیداری ہوئی تھی اس میں پھندیوں کا بڑا ہاتھ تھا ۔ وہاں ایک بہت « بڑا پھونگی » برٹش گورنمنٹ کے خلاف روزہ رکھ کر مرگیا تھا ۔ اسکا جنازہ وہاں کے دستور کے موافق لوگوں کے درشنوں کیلئے محفوظ رکھا گیا تھا ۔ میں نے بھی اس کا درشن کیا تھا ۔

میرے اوپر دو باتوں کا بڑا اثر تھا ۔ ایک تو یہ کہ برھما کے ساتھ ہمارا بہت پرانا اور گہرا تعلق ہے ۔ میں ٹھیک طور سے نہیں کہہ سکتا کہ « برھما » میں بدھ مذہب کا پرچار

کب اور کیسے ھوا، اور کس نے کیا. لیکن آج بھی وہ
دھرم وھاں کے لوگوں میں بہت سختی سے جاری ھے، زندہ
اور بیدار ھے. جس کی علامتیں صرف بڑے بڑے سنہرے
بدھ مندروں ھی میں نہیں بلکہ پھونگیوں کی زندگی انکا
کردار اور برھمیوں کی رھن سہن میں قدم قدم پر ملتی ھیں.
چھوٹے چھوٹے بچوں کی تعلیم زیادہ تر ان پھونگیوں کے
ھاتھوں ھی میں ھے. ایک بہت ھی معمولی منظر ھے کہ
کمسن جوانوں کی ایک بڑی جماعت جلوس کی طرح روزانہ
دیکھی جاسکتی ھے. یہ پھونگیوں کے نئے چیلے ھوتے ھیں
جو وقت پر پھونگی ھونگے اور جو بچپن ھی سے اس زندگی
کیلئے تیاری کر رھے ھیں. دوسرا اثر یہ پڑا کہ میں نے
یہ دیکھا کہ ھندوستان نے اگرچہ کبھی دوسرے دیس پر
اپنی سیاسی سیادت جمانے کیلئے حملہ نہیں کیا، پھر بھی اس
کا مذھبی اور بنیادی اصول دنیا کے بہت بڑے حصہ پر قائم
ھوگیا، جو آج بھی قائم ھے. وہ اقتدار تلوار اور ھتھیاروں
کے ذریعہ قائم نہیں کیا گیا تھا. بلکہ مذھب نیکی، خوش
اخلاقی، پریم و محبت اور خوش چلنی کی بنیاد پر قائم ھوا

تھا. یہی سبب ہے کہ دوسرے طریقہ کے سامراج نہ معلوم کتنے ہوئے اور ٹوٹ پھوٹ گئے، پھر بھی یہ سامراج آجتک قائم ہے. برھما کے لوگ آج بھی ہندوستان کے ان مقاموں کو جنکا مہاتما بدھہ کی زندگی سے تعلق ہے مقدس مقام مانتے ہیں. ایسے مقاموں میں بدھہ گیا، سارناتھ، کسیا، لومبھی، وغیرہ بہت بڑے ہیں. ان مقاموں کے ہر ایك عقیدتمند خادم کے طریقے صرف برھما ھی میں نہیں ہیں، بلکہ ان سبھی ملکوں میں ہیں جہاں بدھہ مذھب آج تك رائج ہے، آج بھی وھاں جاری ہیں.

جب میں مدراس کانگریس کے بعد دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع اور جنوری سنہ ۱۹۲۸ع میں چند دنوں کیلئے لنکا گیا تھا، تو یہی خیالات وھاں بھی میرے دل میں پیدا ہوئے. انہیں احساسات نے میرے دل میں یہ خیال ڈالا تھا. ھمارا یہ فرض ہے کہ بدھہ گیا اور بدھوں کے دوسرے مقدس مقامات کا انتظام ھم ایسا کردیں کہ ساری دنیا کے بدھہ مطمئن ہوجائیں. اور انتظام بھی ان استھانوں کے مرتبہ کے قابل ہو. یہ تاریخ کے حیرت انگیز کارناموں کا ایك عجیب نمونہ

ہے کہ آج اپنے پیدائشی مقام میں بدھہ مذہب نہیں پایا جاتا. بہار اور یوپی (صوبہ متحدہ) میں جہاں مہاتما بدھہ نے جنم لیا، عبادتیں کیں، گیان اور دھیان سیکھا، ریاض و مجاہدہ کیا، وھاں شاید ھی انگلیوں پر گننے کے قابل چند «بدھہ مت» کے لوگ مل سکیں گے. لیکن بدھہ مذہب کے پیرو کڑوروں کی تعداد میں آج دوسرے دیسوں میں ملتے ھیں. ایك طرف تبت، ترکستان، منگولیا، چین، کوریا، جاپان، اور دوسری طرف سیلون، برھما، سیام، ھندچین؛ اور ھندوستانی جزیروں میں آج بھی بدھہ مذہب وھاں کے رھنے والوں کی زندگی کا سہارا بنا ھوا ہے. میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیوں اور کیسے ھوا. اس ملك میں مورخوں کا یہ کام ہے کہ وہ اس بات کی تلاش کریں کہ بدھہ مذہب ھندستان میں کیسے فنا ھوگیا.

یہ نہیں مانا جاسکتا کہ ھندوؤں نے بدھہ مذہب کو مادی طاقت سے دبا دیا ہے. اس کا ناقابل تردید ثبوت یہ ہے کہ ھندو مذہب نے برابر اپنی رواداری کو صرف دکھایا ھی نہیں بلکہ اپنے اصولوں میں اسے اونچا مقام بھی دیا.

ہندو مذہب نے مہاتما بدھہ کو بھی اپنے اوتاروں میں مان لیا ہے. اس سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں نے بدھہ مذہب کو زبردستی نہیں دبایا اور نہ فنا کیا. بدھہ مذہب کے اصول بیشتر قدیم مروجہ «سناتن دھرم» کے اصول ہیں. انمیں جو کچھ نئی باتیں تھیں. یا زندگی اور رہن سہن میں ان کے ذریعہ سے جو بھی تبدیلیاں ہوئی تھیں ان سبکو ہندوؤں نے اپنا لیا. وقت پر ہندو دھرم اور بدھہ مت کا فرق دور ہو گیا. آخر میں ہندو دھرم ہی رہ گیا. اسکی تصدیق حال کی کچھ مذہبی تحریکوں کی تاریخ سے بھی ہوتی ہے.

برہمو سماج ہندو دھرم ہی کی ایک شاخ سمجھی جاتی ہے لیکن موجودہ ہندو دھرم اور اسمیں کافی فرق تھا. وقت پر وہ فرق بھی کم ہوتا گیا. اب کچھ دنوں میں وہ فرق یکبارگی فنا ہو جائیگا. اسی طرح نہ جانے کتنی شاخیں سناتن دھرم سے نکلیں اور فنا ہوگئیں. بدھہ مذہب غیر ملکوں میں پہنچگیا اسلئے وہاں وہ رہ گیا. اس وجہ سے وہ غیر ملکوں میں تو پایا جاتا ہے لیکن اپنی جنم بھوم میں نہیں. لنکا، تبت، چین وغیرہ میں، کب اور کس طرح کس کے

ذریعه سے پرچار ھوا، اس کا بہت کچھ پتـه مورخوں کو لگ چکا ھے. وہ ایك عجیب کہانی ھے جسے ھمارے ملك کے لوگوں کو جاننا چاھئے. یه کام عالموں کا ھے که اسے ھماری تاریخ کی کتابوں میں مناسب اور موزوں جگه دیں تاکه سبھی لوگ اس سے واقف ھوجائیں.

جین دھرم کا پرچار بھی تقریباً اسی وقت ھوا جس وقت بودھه دھرم کا ھوا تھا. جہاں تك میں جانتا ھوں جین دھرم کے بعد جین دھرم کے بانی مہابیر کی پیدائش بودھه کی پیدائش سے کچھ پہلے ھی ھوئی تھی. لیکن دونوں ایك ھی زمانه میں تھے. دونوں نے اھنسا کو دھرم کا بڑا جز بتایا تھا. دونوں نے اپنی زندگی میں ھی تمام ملك میں پھر کر اپنے مذھب کا پرچار کیا تھا. دونوں کا صرف زمانه ھی ایك نہیں تھا. بلکه کام کا میدان بھی ایك تھا یعنی ھندوستان کا وھی حصه جسے آج بہار کہتے ھیں. اور یوپی کا پوربی حصه. بدھه مذھب وقت پر غیر ملکوں میں بھی گیا. اشوك اعظم کے زمانے میں ھی وہ ھندوستان کے بھی بہت سے حصوں میں پھیل گیا تھا. لیکن جین مذھب بہار سے نکل کر

هندوستان کے اندر ہی پھیلا. بہار سے پوربی دکھن کا راستہ لیکر دوردراز دکھن تک گیا. پھر وہاں سے اتر کی طرف بڑھکر پچھم تک چلا گیا. یہ ایک تعجب خیز واقعہ ہے کہ اپنے جنم استھان میں دونوں مذہب فنا ہوگئے. بودھہ تو یکبارگی لیکن جینی بھی جتنے آج دوسرے صوبوں میں پائے جاتے ہیں اتنے بہار میں نہیں. اور جو ہیں بھی وہ اس زمانہ کے نہیں ہیں جب جین دھرم کی بنیاد پڑی تھی. وہ پرانے جینیون کی نسل سے شاید ہی ہوں. دوسری جگہ سے آکر بہار میں بس گئے ہیں. لیکن جس طرح سے "بدھہ مت" کے مقدس مقام وغیرہ بہار میں ہیں اسی طرح جینیوں کے بھی ہیں. جن میں "پاواپوری" راجگڈھہ پساشر بہ باتھ وغیرہ بڑے مقامات ہیں.

ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ دونوں دھرموں کے بانیوں نے اہنسا کو اگرچہ اعلی دھرم مانا ہے. پھر بھی اہنسا کا مطلب الگ الگ لیا. آج شاید ہی کوئی بودھہ ہو جو گوشت نہ کھاتا ہو. انہوں نے کسی جانور کو خود مارنا تو گناہ سمجھا لیکن اگر کوئی دوسرا مارے تو گوشت کھانا برا

نہیں سمجھتے۔ برخلاف اس کے جینیوں نے اس «اهنسا» کو اتنی دور تک پہنچایا کہ مچھر اور موذی جانوروں تک کو مارنے کو بھی وہ پاپ سمجھنے لگے. ان کے رشی‌منی تشدد سے بچنے کے لئے کئی طریقوں سے تکلیف اٹھاتے ہیں. معمولی گھر والے بھی کھانے پینے کے متعلق بہت سختی سے اصولوں کی پابندی کرتے هیں جس میں کسی جاندار کی جان انجان طور بھی نہ جائے. لیکن چاهے جس طور سے هو دونوں دھرموں میں اس بنیادی اصول کی عملی شکل میں اتنا فرق ضرور هوگیا هے. آج اهنسا کے اصول کو تو دونوں هی مانتے هیں. لیکن آج کی دنیا کو اس اهنسا کی ضرورت هے جس کو مہاتماجی نے هر طریقہ سے اپنی زندگی کا جز بنانے کی کوشش کی وهی آج کل کی تکلیفوں سے نجات حاصل تدبیر هے.

اٹھارھواں باب

لاھور کانگریس نے کانگریس کے عقیدے کو بدل کر کامل آزادی کو حاصل کرنا اپنا عقیدہ بنا لیا. اور یہ بھی طے کیا کہ اس کے لئے ستیہ گرہ کی جائے. میں اسوقت بہت بیمار تھا اس لئے کانگریس میں نہیں جاسکا. کانگریس کے بعد جب میں اچھا ھوگیا اور تھوڑی بہت طاقت بھی آ گئی اسوقت ۲۶ جنوری کو سب سے پہلے کامل آزادی کا دن منائے جانے کے جلسہ میں اپنے گاؤں «جیرادئی» سے آ کر جہاں میں آرام کر رھا تھا شریک ھوا. اس کے بعد ھی سے ستیہ گرہ کی تیاری اور بھی زور سے ھونے لگی. سابرمتی میں ورکنگ کمیٹی (مجلس عاملہ) کا جلسہ ھوا. اس میں میں شریک ھوا. مہاتماجی نے کہا کہ «نمک کے قانون کو توڑ کر ستیہ گرہ کی جائے». نمک پر ٹیکس لگا ھوا تھا جس سے ھند سرکار کو کڑوروں روپیہ کی سالانہ آمدنی ھوتی تھی. کوئی آدمی بغیر گورنمنٹ کے حکم کے اور ٹیکس ادا کئے نہ تو نمک بنا سکتا تھا اور نہ بیچ سکتا تھا. یہ ایک ایسا

ٹیکس تھا جس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا تھا. غریب سے غریب آدمی کو بھی چاہے وہ دو وقت کے بعد بھی کچھ کھائے ہر ایک لقمہ پر ٹیکس دینا ھی پڑتا تھا. کیونکہ بغیر نمک کے وہ ایک لقمہ بھی نہیں کھا سکتا تھا.

هندستان تین طرف سمندر سے گھرا ھوا ھے. سمندر کے کنارے بغیر کسی محنت کے بٹور لینے سے مفت ھی میں نمک مل سکتا تھا. لیکن غریب سے غریب آدمی بھی بغیر ٹیکس دئے اس نمک کو بھی جسے قدرت مفت دیتی تھی نہ اٹھا سکتا تھا اور نہ کھا سکتا تھا. اس کا نتیجہ یہ ھوتا تھا کہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ھندوستانی لوگ نمک بھی کم کھاتے، اس کا اثر یہاں کے لوگوں کی تندرستی پر ضرور برا پڑتا ھوگا. کیونکہ نمک ایک بہت زیادہ ضروری غذائی چیز ھے. مہاتماجی نے سوچا تھا کہ ستیہ گرہ سے ھم غریب سے غریب آدمیوں کو بھی دکھلا دیں گے کہ یہ ظالمانہ ٹیکس اٹھا دینے کی کوشش انہیں لوگوں کے لئے کی جا رھی ھے. اسمیں کسی دوسرے کا کچھ بھی نقصان نہ تھا. صرف گورنمنٹ کو ھی ٹیکس کا نقصان ھوتا. جب مہاتماجی نے یہ تجویز

ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کی تو ہم میں سے بہت سے لوگوں کے دل میں یہ شك پیدا ہوا کہ لوگونمیں یہ بات کہاں تك جوش پیدا کرسکے گی، خاصکر ایسی جگہ کے لوگوں میں جو سمندر کے کناروں سے دور رہتے ہیں. اور جہاں کے لوگوں کو دوکانوں ہی سے نمك خرید کر کھانا پڑتا ہے ان بیچاروں کو اسکا بھی پتہ نہیں تھا کہ جو نمك وہ خرید رہے ہیں اسکے داموں میں ٹیکس کا بھی جز ہے. اور وہ بھی نمك کے اصلی دام سے کہیں زیادہ ہے. وہ اگر نمك کا قانون توڑنا چاہیں گے تو کیسے توڑیں گے؟ کیونکہ ان کے یہاں نہ تو سمندر کے کنارے کا نمك ہی ہے جسے وہ اٹھا لیں اور نہ سمندر کا پانی جسکو ابال کر نمك بنالیں. اس لئے قانون کے توڑنے میں بھی بڑی دشواری دکھائی دی. لیکن مہاتماجی اس پر اڑے رہے. آخر میں طے ہوا کہ نمك کا قانون توڑا جانا چاہئے.

بہار کے کئی ضلعوں میں مٹی سے شورہ اور نمك اس سے پہلے بنایا جاتا تھا. میں نے اپنے گاؤں ہی میں دیکھا تھا کہ ایك ذات کے لوگ جو اپنے پیشہ ہی کی وجہ سے «لونیا»

کہلاتے ھیں مٹی سے شورہ بنایا کرتے تھے. اسی طرح اور بھی بہت سی جگہیں ایسی ھیں جہاں مٹی سے نمک بن سکتا ھے. کہیں تو اس قسم کی جھیلیں بھی ھیں جنکا پانی نمکین ھے اور جس سے نمک بن سکتا ھے. یہ سوچا گیا کہ سمندر کے کنارے کے لوگ نمک بٹور کر نمک کا قانون توڑ سکیں گے، لیکن دوسری جگھوں میں کچھ لوگ مٹی سے ھی نمک بنا کر قانون کو توڑیں گے اور کچھ لوگ غیر قانونی نمک کا بیوپار کر کے اسکو توڑیں گے. مضمونوں اور اخباروں سے مٹی سے نمک بنانے کا طریقہ بھی لوگوں کو بتایا گیا. مجھے اس کے متعلق بہت شبہ تھا کہ بہار کے لوگوں میں ھم نمک کے قانون توڑنے کا آیا بہت جوش پیدا کر سکیں گے یا نہیں. مہاتماجی سے یہ بات میں نے کہی اور ان کو بتایا بھی کہ ایک دوسرا قانون ھے جو سبھی گاؤں میں جاری ھے. اور جسکی وجہ سے لوگوں میں بڑی بے چینی بھی ھے.

بہار کے ھر گاؤں میں ایک یا دو یا اس سے بھی زیادہ چوکیدار رکھے جاتے ھیں، جنکا یہ کام ھوتا ھے کہ گاؤں

کی چوکیداری کریں تاکہ چوری، ڈکیتی نہ ہونے پائے. اور اگر کسی قسم کا کوئی حادثہ ہو جائے تو وہ پولیس افسروں کو اسکی خبر کردیں، فوتی، پیدائش کی رپورٹ تھانہ میں پہنچائیں. ہر ایك قسم کی خبر گورنمنٹ کو دیتے رهیں اور گورنمنٹ کا حکم بھی گاؤں کے لوگوں تك پہنچاتے رهیں. گورنمنٹ کا کوئی دوسرا نوکر بہار کے گاؤں میں نہیں رهتا هے. کیونکه وهاں دوامی بندوبست (پرمننٹ سٹلمنٹ) کی وجه سے گورنمنٹ کو جنتا سے زمین کی مال گزاری وصول نہیں کرنی پڑتی تھی، زمیندار خوذ وصول کر کے مقررہ رقم گورنمنٹ کو پہنچا دیا کرتا هے. اس لئے ایك طرح سے گورنمنٹ کا نمائندہ گاؤں میں چوکیداری کرتا هے. اسکو جو تنخواہ دی جاتی هے وہ گاؤں کے لوگوں سے هی ایك خاص ٹیکس کے ذریعه سے جسے چوکیداری ٹیکس کہتے هیں وصول کیا جاتا هے. یه ٹیکس گاؤں کے تقریباً سب لوگوں کو دینا پڑتا هے. اور حیثیت کے مطابق چھ آنه سے لیکر بارہ روپے سالانه تك

ہوتا ہے. گاؤں کے لوگوں میں اس سے بڑی بے چینی ہے کیونکہ یہ بڑی سختی سے وصول کیا جاتا ہے. صرف یہی نہیں، ٹیکس لگانے میں بھی بڑی زیادتی ہوا کرتی تھی. کیونکہ غریبوں پر زیادہ لاد دیا جاتا ہے. بڑے لوگ مالدار ہونے پر بھی کم دیتے ہیں.

میں نے مہاتماجی سے کہا کہ یہ ٹیکس براہ راست ہر آدمی کو دینا پڑتا ہے اسلئے وہ اسے جانتا ہے. اور اس سے وہ بیچین بھی ہے لیکن لوگوں کو یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ نمک کا ٹیکس کب ان سے لیا گیا. کیونکہ ٹیکس نمک بنانے والے ہی دے دیتے ہیں، نمک کے خریدار کو الگ سے نہیں دینا پڑتا ہے. اسکو تو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ دام میں سے کتنا ٹیکس کی شکل میں دیا اور کتنی نمک کی اصلی قیمت دی ہے اس لئے نمک کے قانون سے اتنی بے چینی دیکھنے میں نہیں آتی. لوگوں کو اس کے توڑنے میں اتنا جوش نہیں ہوگا. میں نے مہاتماجی سے اس لئے یہ اجازت چاہی تھی کہ بہار میں چوکیداری ٹیکس نہ دینے کی اجازت دے دی جائے، تاکہ وہاں ہم لوگ ستیہ گرہ کو یہی شکل دے دیں. انہوں

نے ہم سے کہا «ایسا مت کرو کیونکہ اگر ایسا کروگے تو جلد ہار جاؤگے اور گورنمنٹ تم کو دبا دے گی» لیکن اس وقت یہ بات میری سمجھ میں پوری طرح نہ آئی پھر بھی میں ایسی باتوں میں ان کے تجربہ کا ضرور قائل تھا. میں نے مان لیا کہ نمک کے قانون کے خلاف ہم جہاں تک ہو سکے ستیہ گرہ کی کوشش کریں گے. میرے دل میں یہ ڈر تھا کہ اس میں ہم زیادہ کامیاب نہیں ہونگے. پھر بھی میں اتنا تو جانتا تھا کہ بہار کے بہت سے ضلعوں میں نمک کا قانون توڑنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوگی. کیونکہ وہاں مٹی سے نمک بنانے والے سبھی گاؤں میں تھے. اور وہ کام دوسرے لوگ بھی باآسانی کرسکتے تھے. ہم نے بہار لوٹ کر نمک بنانے ھی کا کام شروع کرایا. دوسری جگہوں کی طرح اسمیں تعجب خیز کامیابی ہوئی.

مہاتماجی نے یہ ارادہ کیا وہ خود بھی نمک کا قانون توڑینگے. اس کیلئے وہ احمدآباد کے سابرمتی آشرم سے «ڈانڈی» تک پیدل ھی جائیں گے. جو سمندر کے کنارے ھے. ان کے جانے کی تاریخ مقرر ہوگئی. ڈانڈی پہونچ کر ٦ اپریل کو

نمك اکٹھا کرنے کا ارادہ کیا. سابرمتی آشرم سے ڈانڈی کافی دور ہے. وہاں تک پیدل پہونچنے میں تین ہفتوں سے زیادہ لگتے ہیں. درمیان کے پڑاؤ مقرر ہوگئے مہاتماجی ۸۰ آدمیوں کے ساتھ آشرم سے ڈانڈی کے لئے روانہ ہوگئے. چلتے وقت انہوں نے اعلان کردیا کہ «اب وہ تو سوراج لیکر ہی آشرم میں لوٹیں گے. نہیں تو ان کی میت لوگ سمندر میں بہتی پائیں گے» انہوں نے یہ بھی اعلان کردیا کہ «سب جگہ لوگ تیاریاں کریں لیکن جبتك وہ خود ستیہ گرہ نہ کریں اور دوسروں کو ستیہ گرہ کرنے کا حکم نہ دیدیں اس وقت تك کوئی ستیہ گرہ نہ کرے، مہاتماجی کا یہ سفر جیسے ہی شروع ہوا سارے دیس میں بڑا جوش پیدا ہوگیا. انکے ساتھ ۸۰ ستیہ گرہی تھے، لیکن انکے پیچھے پیچھے ہزارہا آدمیوں کی بھیڑ چلتی تھی. بھیڑ کچھ دور تك جاتی اور جب دوسرے گاؤں کے لوگ آجاتے تو پچھلے گاؤنکے لوگ واپس ہوجاتے، اس طرح روزانہ بھیڑ ساتھ میں رہتی. سارے ملك میں روز بروز جوش بڑھتا ہی گیا. یہ جوش صرف وہیں نہیں تھا جہاں مہاتماجی سفر کررہے تھے بلکہ یہ سارے ملك میں

دیکھنے میں آیا. سبھی جگہوں پر لوگ ستیہ گرہ کی تیاری اور نہایت بے چینی کے ساتھ مہاتماجی کے حکم کا انتظار کرنے لگے. میں نے جواہرلال جی کو جو اس سال کانگریس کے صدر ہوئے تھے دعوت دی. اور ان کے ساتھ بہار کے کئی ضلعوں کا دورہ کیا.

انیسواں باب

اس جگہ ستیہ گرہ کی تاریخ نہیں دی جاسکتی، لیکن اس کی کچھ ایسی باتیں جو خاص طور پر اھمیت رکھتی ھیں دی جاسکتی ھیں. اوپر بیان کیا جا چکا ھے کہ مہاتما جی نے ڈانڈی جاترا کے موقع پر نکلتے وقت کہا تھا کہ « یا تو میں سوراج لے کر ھی آشرم میں لوٹوں گا یا میں ختم ھوجاؤں گا» انہوں نے اپنے اس قول کو پورا کیا کیونکہ وہ پھر سابرمتی آشرم میں نہیں لوٹے اس ستیہ گرہ کے ختم ھونے کے بعد وہ وردھا چلے گئے. اور وھاں کچھ عرصہ رھنے کے بعد وھاں سے تھوڑی ھی دور جا کر ایک گاؤں میں رھنے لگے جس کا نام اب «سیوا گرام» ھے. وہ کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے تھے جس میں ھر لفظ کا کوئی مطلب نہ ھوتا. اور جس کے مطابق وہ عمل کے لئے تیار نہ ھوتے. اتنا بڑا آشرم کہ جس کے بنانے میں انہوں نے تقریباً پندرہ برس لگائے تھے، اور جس کی عمارتوں میں لاکھوں روپے انہوں نے خرچ کئے تھے، اور مختلف قسم کے تعمیری کاموں کا مرکز

بنا ہوا تھا، جہاں سچے ستیہ گرہی تیار ہوگئے تھے، جہاں کی زندگی اور رہن سہن سارے ملک کے خادموں کے لئے ایک مثال اور ہدایت تھی، جس کو انہوں نے اسی محبت سے پالا پوسا تھا، جس طرح ماں لاڈ پیار سے بچوں کو پالتی ھے، اس کو ہمیشہ کے لئے انہوں نے چھوڑ دیا. اس سے مطلب یہ نہیں کہ آشرم ٹوٹ گیا، یا جو کام وھاں ہورھا تھا ختم ہوگیا. بلکہ اس کا صرف اتنا ھی مطلب ھے کہ مہاتماجی وھاں خود نہیں گئے. جو لوگ وھاں رہ گئے تھے وھی وھاں کے کاموں کو چلاتے رھے. بعد میں وہ ہریجن خدمت کے کام میں لگا دیا گیا. آج بھی وہ اسی کام میں مصروف ھے. «مہاتماجی» سنت تلسی داس جی کی اس چوپائی کو یاد رکھتے تھے اور اس کے مطابق عمل کیا کرتے تھے:

«رگھوکل»[1] کا طریقہ ھے سدا سے
نہ جائے بات چاھے جان جائے (مترجم)

اس کی دوسری روشن مثال کچھ دنوں بعد دیکھنے میں

۱ — مہاراج رام چندر جی کے ایک مورث اعلی کا نام «رگھو» تھا، اسلئے یہ خاندان «رگھو کل» کہلایا. کل بمعنی خاندان۔ یہ اس «چوپائی» کا شعر ھی میں ترجمہ ھے جو اصل کتاب میں ھے.

آتی ھے . جب ۱۹۳۲ میں انہوں نے بردوا جیل میں ھریجنوں
کے لئے الگ انتخاب کے مسئلہ کی مخالفت کی تھی . جب وہ
۱۹۳۱ع میں گول میز کانفرنس میں گئے تھے تو وھاں ھندو
مسلم مسئلہ حل نہ کرسکے . انہوں نے وھیں دیکھ لیا تھا کہ
ھریجنوں کی طرف سے بھی علحدہ انتخاب کے میدان کی مانگ
ھے . اس وقت انہوں نے ایك تقریر میں ایك یہ بات کہدی
تھی کہ علحدہ انتخاب کا حق دیکر اگر ھریجنوں کو دوسرے
ھندوؤں سے ھمیشہ کے لئے اچھوت رکھا گیا تو وہ اس کی
مخالفت اپنی جان دیکر بھی کریں گے . وزیر اعظم میکڈانل نے
ھریجنوں گے لئے الگ چناؤ کا حق اپنے فیصلے میں منظور
کرلیا. اس وقت مہاتما جی جیل میں تھے . انہوں نے جیل
ھی سے گورنمنٹ کے ساتھ خط وکتابت شروع کی . اپنی اس
بات کو بھی یاد دلایا اور کہا کہ اگر گورنمنٹ اس فیصلہ کو رد
نہیں کرے گی تو ان کو اپنے عہد کے مطابق اپنی جان ھی کی
بازی لگا دینی پڑے گی. جب گورنمنٹ نے ان کی بات اس
وقت نہین سنی، تو انہوں نے روزہ رکھا اور اعلان کیا کہ
کہ جب تك وہ فیصلہ نہیں بدلا جائے گا تب تك ایك دانہ

بھی نہیں کھائیں گے. خوش قسمتی سے فیصلہ میں یہ شرط تھی کہ اگر سب فریق جن کا کسی خاص مسئلہ سے تعلق ہو مل کر ایک رائے سے اس میں تبدیلی کرانا چاہیں تو وہ کی جا سکتی ہے. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہریجنوں اور دوسرے ہندوؤں کے درمیان یہ سمجھوتہ ہوگیا کہ حق انتخاب علحدہ نہیں ہوگا. لیکن ہریجنوں کے لئے مختلف اداروں میں تعداد کے اعتبار سے ان کی جگہیں محفوظ کردی جائیں گی. شری میکڈانل کے فیصلہ میں ان کو جتنی جگہیں ملی تھیں اس سے کہیں زیادہ جگہیں ہریجنوں کو مل گئیں. لیکن چناؤ کا طریقہ دوسرا کردیا گیا، علحدہ حق انتخاب منسوخ کردیا گیا. سمجھوتہ ہوتے ہی برٹش گورنمنٹ نے اسے مان لیا اور اپنے فیصلے کو سمجھوتے کے مطابق بدل دیا. جس وقت مہاتماجی نے وہ بات گول میز کانفرنس میں کہی تھی اس وقت کسی نے یہ مطلب نہیں سمجھا تھا کہ وہ اس کو حرف بحرف پورا کرنے کی کوشش کریں گے. جب گورنمنٹ نے انکے لکھے ہوئے خطوط شائع کردئے جس میں انہوں نے اس بات کی طرف دھیان دیتے ہوئے روزہ کے ذریعہ سے پورا کرنے

کے لئے اپنے ارادے کا اعلان کیا تھا، تو سارے ملك میں کھلبلی مچ گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مندرجہ بالا سمجھوتہ ہوکر برٹش گورنمنٹ کے فیصلہ میں ترمیم ہوگئی.

جب مہاتماجی «ڈانڈی» جاترہ کے لئے تیار ہو رہے تھے تو کچھ لوگوں کا خیال ہوا کہ جاترہ شروع کرنے کے وقت سارے ملك کے لئے ایك سندیس دیں. جو گراموفون کے لئے ریکارڈ کرلیا جائے اور وھی سارے ملك میں لوگوں کو سنایا جائے. امید کی جاتی تھی کہ اس طرح یہ تاریخی پیغام مہاتماجی کے لفظوں میں ھی بلکہ ان کی اپنی آراز میں بھی گاؤں گاؤں پہنچا دیا جائے. یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مہاتماجی کو گورنمنٹ کب تك آزاد رهنے دے گی. یہ سوچ لیا گیا تھا کہ اس حالت میں ان کا پیغام انکی اپنی ھی آواز میں ان کے جیل جانے کے بعد عوام کو پہنچتا رہے گا، جو ستیہ گرہ کے لئے ضروری اور جوشیلا جذبہ پیدا کرنے والا ثابت ہوگا. اس وقت میں بھی سابرمتی میں تھا. لوگوں نے کہا کہ میں ھی اس تجویز کو مہاتماجی کے سامنے پیش کروں. اس کا جواب جو کچھ مہاتماجی نے دیا اس سے انکے اٹل بھروسے اور انکی

صداقت کا ثبوت ملتا ھے۔ انہوں نے کہا «اگر میرے پیام میں سچائی ھے تو میں جیل کے اندر رھوں یا باھر اسے لوگ سن ھی لیں گے۔ لیکن اگر اس میں سچائی نہیں ھے تو تم اگر ھزار کوششیں بھی کرو گے تو گراموفون کے ذریعہ وہ لوگوں کے دلوں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اسی طرح یہ ستیہ‌گرہ شروع کی جا رھی ھے۔ اگر سچ مچ ستیہ‌گرہ ھے اور ھم اسے پوری سچائی اور اھنسا پر چل کر پورا کرتے ھیں تو وہ ضرور کامیاب ھوگی۔ چاھے لوگ میرے الفاظ سنیں یا نہ سنیں میری اپنی آواز ان کے کانوں تک پہنچے یا نہ پہنچے، اس لئے ایسے ریکارڈ کی نہ تو کوئی ایسی ضرورت ھے اور نہ اس سے کوئی فائدہ ھی ھوگا»۔ اس کے بعد پھر کسی کی ھمت نہ ھوئی کہ وہ کچھ زیادہ اصرار کرے۔

جب ستیہ‌گرہ شروع ھوئی اور اچھے اچھے لوگ جیل جانے لگے تو صرف جنتا ھی پر اس کا اثر نہیں ھوا بلکہ گورنمنٹ ملازموں پر بھی اثر پڑتا ھوا دکھائی دیا۔ خاص کر ان لوگوں پر جن پر اس تحریک کے دبانے کا بوجھ ڈالا گیا تھا۔ ایسا سبھی جگھوں پر دیکھا گیا۔ میں اس موقعہ پر بہار

کے کچھ واقعات بیاں کر دینا چاھتا ھوں جن کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ھے. یہ چمپارن کا ذکر ھے کہ سب سے بڑے کارکنوں میں سے ایک «وپن بہاری ورما» تقریباً آدھے ضلع کا دورہ کر کے ستیہ‌گرہ کریں گے. جیسا مہاتماجی نے «ساورمتی» سے ڈانڈی تک سفر کرنے کے بعد نمک کے قانون کو توڑا تھا، «وپن باپو» بھی پیدل ھی کچھ رضاکاروں کے ساتھ نکلے، درمیان میں چار پانچ میل کے بعد ٹہر جاتے تھے. اس طرح جہاں ستیہ‌گرہ کرنے کا ارادہ تھا وھاں کئی دنوں میں پہنچے. راستہ میں جنتا نے بڑی آؤبھگت کی جہاں ٹہرنا ھوتا وھاں پہلے سے لوگ تیاریاں کر لیتے تھے. اس سے بڑی بیداری پیدا ھوئی اور جوش بڑھا. ستیہ‌گرہ کے مقام پر نمک بنانے کے لئے لوگوں نے مٹی اور پانی پہلے ھی سے رکھ لیا تھا. پولیس پہلے ھی سے گرفتار کرنیکے لئے تیار تھی. تھوڑی دور پر ایک باغیچہ میں مجسٹریٹ کا خیمہ بھی لگا ھوا تھا جہاں وہ پہلے ھی سے مقدمہ سننے اور سزا دینے کے لئے تیار بیٹھا تھا. یہ پہلا دن تھا جب کہ صوبہ میں باضابطہ ستیہ‌گرہ ھونے والی تھی. دوسری جگہوں میں

بھی لوگوں نے اسی طرح ستیہ گرہ کرنے کا انتظام کیا تھا.

میں خود چمپارن چلا گیا. کیونکہ مہاتماجی کا اس مقام سے کافی تعلق رہ چکا تھا. میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ نمك بنانے کی تقریب ختم ہو چکی تھی. قانون توڑنے والے گرفتار ہوکر مجسٹریٹ کے پاس پہنچ چکے تھے. مجسٹریٹ مقدمہ سننے جا رہا تھا، مجسٹریٹ کا چہرہ اترا ہوا اور اداس تھا گردن لٹکائے میز پر ہی اس کی آنکھ لگی تھی. جب تك ہم لوگ وہاں رہے اس نے ایك بات بھی نہیں کی اور سر بھی نہیں اٹھایا، جو کچھ لکھتا پڑھتا نیچے ہی سر کئے ہوئے لکھتا تھا. اسی حالت میں اس نے سب کام پورا کیا اور چھ ماہ کی سزا کا حکم سنا دیا. دیکھنے سے لوگوں کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل میں بڑی چوٹ لگ رہی ہے، لیکن اس کے لئے اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا. اس لئے مجبوراً اپنا کام کرنا ہی تھا. مجسٹریٹ کی ایسی حالت ہونے کی ایك خاص وجہ بھی تھی.

۱۹۲۱ ع میں عدم تعاون بہت زور سے چل رہا تھا. طالب علموں کو کالج چھوڑ کر نکل کر آنے کے لئے کہا گیا تھا.

اس وقت یه مجسٹریٹ اپنے کالج کے ایك طالب علم تھے. پڑھنے میں بہت تیز تھے اور ان کو وظیفـه بھی ملتا تھا. اسوقت وہ بی اے میں پڑھ رہے تھے. جس کا امتحان دو تین ماہ کے بعد ھی ہونے والا تھا، جب کالج کے دوسرے طالبعلم کالج چھوڑ کر نکلے تو یه بھی انکے ساتھ نکل آئے. جو قومی کالج ھم نے کھولا تھا اسمیں آکر داخل ھوگئے. لیکن یه خبر پاتے ھی ان کے گھر کے لوگ انہیں زبردستی پکڑ لے گئے. قومی کالج سے جاتے وقت بھی میں نے انکے چہرے پر وھی اداسی اور پریشانی دیکھی تھی جو آج نو برس کے بعد ان کے مجسٹریٹی چہرے پر دیکھنے میں آئی. ھاں قومی کالج سے چلے جانے کے بعد امتحان پاس کرکے مجسٹریٹ ھوگئے. آج انکی آنکھیں اور بھی اوپر نہیں اٹھتی تھیں کیونکه میں وھاں موجود تھا.

سزا ھونے پر «وپن باپو» موتی‌ھاری دیر میں پہنچائے گئے وھاں جیل پر بڑی بھیڑ ھوگئی تھی. جیل کے ملازم کچھ گھبرا رہے تھے که کہیں بلوہ فساد نه ھوجائے. لیکن کچھ ھوا نہیں. جب میں وھاں سے پٹنه لوٹا تو سنا که کچھ نوجوان

نے نمك بنانے کا اعلان کردیا ہے . بانکی پور سے پٹنہ سٹی کے لئے جلوس بنا کر روانہ ہوئے تھے . لیکن راستہ میں ایك جگہ پولیس نے انکو روك دیا ، لڑکوں نے واپس جانے سے انکار کردیا . لیکن پولیس نے ان کو گرفتار نہیں کیا بلکہ لڑکے سڑك پر قطار باندھے سڑك پر بیٹھے ہوئے تھے . میں رات کو کشتی سے اتر کر سیدھا سلطان گنج کے تھانہ پر گیا جہاں لڑکوں کے پڑے رہنے کی خبر تھی . میں نے جاکردیکھا کہ بیچ سڑك لڑکے سو رہے ہیں ، پولیس کے سپاہی سڑك روکے کھڑے ہیں ، محلہ کے لوگوں نے لڑکوں کو کھانا کھلایا تھا . اور ان کے لئے سڑك پر بستر بھی بچھادئے اس لئے وہ سب کے سب وہیں سورہے تھے . میں نے دیکھ لیا تھا کہ اب رات میں کچھ ہونے والا نہیں ، اسلئے صبح پھر آنے کے خیال سے صداقت آشرم چلا گیا .

دوسرے دن بہت سویرے جب پہنچا تو دیکھا کہ لڑکے تو وہاں کھڑے ہی ہیں ، پولیس بھی انکے مقابلہ میں کھڑی ہے ایك طرف لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جارہی ہے ، دوسری طرف پولیس کے سپاہیوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی . جن میں کچھ

سوار اور بندوق والے سپاھی بھی تھے. ھم لوگ یہی سوچ رھے تھے کہ دیکھیں اب کیا ھوتا ھے. کہ اتنے میں انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ بھی پہنچ گئے. جب ان کو معلوم ھوا کہ میں بھی پہنچ گیا ھوں اور مجمع کو سنبھالنے میں لگا ھوا ھوں تو انہوں نے مجھے تھانہ کے اندر بلا کر کہا کہ ان لڑکوں کو واپس جانے کے لئے کہدیجئے نہیں تو ھم کو سخت کارروائی کرنی پڑے گی. میں نے کہا کہ اگر لڑکوں نے کچھ قصور کیا ھے تو آپ گرفتار کرسکتے ھیں، سزا دینی چاھیں تو وہ بھی دے سکتے ھیں، لیکن میں ان سے واپس جانے کے لئے نہیں کہہ سکتا. اسپر انہوں نے یہ کہا کہ ،اتنی بڑی بھیڑ یہاں اکٹھا ھوگئی ھے کہ اگر کوئی فساد ھوا تو اسکی ذمہ داری آپ کے سر رھے گی. میں نے جواب دیا کہ ذمہ تو میں لیتا ھوں لیکن یہ بھی کہہ دینا چاھتا ھوں کہ لوگوں کی طرف سے کوئی فساد نہیں ھوگا. اگر آپ ان لڑکوں کو راستہ دے دیتے ھیں تو پورا مجمع خود ھی چھٹ جائیگا. بہر حال وہ ایسا کب کرنے والے تھے. میں نے سوچا کہ کہیں اگر گولی چل گئی تو کوئی نہ کوئی سنگین واقعہ

هوسکتا ھے ، اس لئے بہتر یہی ھے کہ کانگریس کے اور ساتھیوں سے مشورہ کرلوں. چنانچہ جب میں نے یہ کہا کہ میں اپنے ساتھیوں سے اس مسئلہ میں مشورہ کرلینا مناسب سمجھتا ھوں، اسوقت انہوں نے دیکھا کہ میں کچھ نرم پڑ رھا ھوں. اس پر وہ کچھ اور تیز ھوکر بولے کہ آپ کو آدھا گھنٹہ کا وقت دیتا ھوں ، اپنی گھڑی میری گھڑی سے ملا لیجئے. مجھکو یہ برا لگا اور میں نے وھیں کہدیا کہ اگر آدھ گھنٹے کے اندر اسکا جواب نہ دیدوں تو آپ سمجھ لیں کہ میں ان کے ھٹانے سے انکار کررھا ھوں، پھر آپ جو جی چاھیں کریں. یہ کہکر میں وھاں سے آشرم کے لئے روانہ ھوگیا.

صداقت آشرم جاکر اور آپس میں مشورہ کرکے ھم سب نے یہ ارادہ کرلیا کہ ان ستیہ گرھیوں کو وھاں سے نہ ھٹانا چاھئے. یہ سب کچھ آدھ گھنٹہ کا وقت پورا ھونے سے پہلے ھی ھوگیا تھا. ھم نے ٹیلیفون سے کہہ دیا کہ ھم ستیہ گرھیوں کو واپس نہیں ھٹائیں گے آپ جو چاھیں کریں. میں یہ کہہ کر فوراً آشرم سے سلطان گنج کے لئے روانہ ھوگیا. اور میں یہ سوچتا جارھا تھا کہ ممکن ھے وھاں سنگین واقعہ ھوگیا ھو یا

گولی وغیرہ بھی چل گئی ہو تو کوئی اچنبھا نہیں. میں جا
ہی رہا تھا کہ راستہ میں اسی مجسٹریٹ کو موٹر میں آتے
ہوئے دیکھا اور اس نے بھی مجھے دیکھ لیا مجھے دیکھکر
وہ مسکراتا ہوا چلا گیا. میں سمجھ گیا کہ کوئی سنگین واقعہ
نہیں ہوا. جب میں وہاں پہنچا تو میں نے سنا کہ اس نے
پہلے تو لڑکوں پر سواروں کو گھوڑے دوڑانے کا حکم دیا.
جب گھوڑے دوڑتے ہوئے دکھائی دئے تو لڑکے بے خوف
ہوکر ساری سڑک گھیر کر لیٹ گئے. گھوڑے نزدیک آکر رکے
اور پھر واپس چلے گئے. ایک دو بار جب ایسا کیا اور لڑکے
نہ ڈرے بلکہ گھوڑوں کو آتے دیکھ کر سڑک پر لیٹ جاتے
تو آخر میں انہوں نے لڑکوں کو زمین سے اٹھواکر موٹر لاری
میں ڈلوایا اور جیل خانے بھیج دیا. بس ان کے ہٹتے ہی ساری
بھیڑ بھی ہٹ گئی. لوگ ادھر ادھر چلے جا رہے تھے کہ
میں وہاں پر پہنچا، مجھ سے یہ سب باتیں کہی گئیں. ہم لوگ
بھی یہی چاہتے تھے کہ ستیہ گرہی گرفتار کئے جاکر جیل خانے
بھیج دئے جائیں یا اور جو کچھ گورنمنٹ کرنا چاہے، لیکن
ہم کو جو کچھ کرنا تھا اسکو ستیہ گرہی نہ چھوڑے. ہم لوگ

پھر جمع ھوکر آئندہ کا پروگرام بنانے کیلئے آشرم میں بیٹھے۔
اس کے بعد سے ستیہ گرھی مسلسل چار بار جلوس نکال کر روزانہ جانے لگے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بر وقت اطلاع دے دی گئی تاکہ پولیس کو چوبیس گھنٹہ تك ستیہ گرھیوں کا انتظار نہ کرنا پڑے، وہ ٹھیك وقت پر آئے اور جہاں چاھے ستیہ گرھیوں کو گرفتار کرے یا جو کچھ کرنا چاھے کرے۔ ٹھیك وقت پر جب ستیہ گرھی جاتے تو پبلك کی بہت بھیڑ ھوجاتی۔ ھم لوگوں کے دلمیں یہی ڈر رھتا کہ ایسا نہ ھو کہ کہیں کچھ فساد ھوجائے۔ کیونکہ جو بھیڑ جمع ھوتی اس کو منتشر کرنے کیلئے پولیس کے افسر ڈنڈے دکھا کر چابکوں سے پیٹا کرتے۔ ھم لوگ بھی اسوقت تك وھاں پہنچ جاتے جس میں امن قائم رھے۔ پولیس کے سوار بلوچی مسلمان تھے جو بہت پہلے ھی سے بہار سرکار کے ذریعہ بہار میں لا کر رکھے گئے تھے۔ دو انگریز افسر ان کے ساتھ گھوڑوں پر وھاں موجود رھتے۔ گھوڑے دوڑا کر ڈنڈے اور چابك مارنے کا کام زیادہ تر دونوں انگریز ھی کرتے۔ اگر کسی کو گرفتار کرنا ھوتا تو دوسرے سوار اسے گرفتار کرکے معمولی پولیس کے

حوالہ کر دیتے۔ جو اسے وہاں سے تھانہ یا جیل میں لے جاتے۔ پروفیسر عبد الباری اور میں دوسرے کانگریسیوں کے ساتھ پہنچ جایا کرتے۔

ایک روز پروفیسر عبد الباری کے خوب ڈنڈے لگے۔ میرے قریب سے بھی گھوڑے دوڑائے گئے لیکن میرے اوپر ڈنڈے کا وار نہیں کیا گیا۔ معلوم نہیں، اتفاق تھا یا جان بوجھکر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ پروفیسر عبد الباری کے بہت چوٹ لگی مگر وہ گرے نہیں، وہ بہت مضبوط تھے ان کے داڑھی بھی تھی اور شکل سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان ہیں۔ ان سے قریب ہوکر ایک بلوچی سوار جا رہا تھا۔ اس نے ان سے آہستہ سے پوچھا «مولوی تم یہاں کیسے آ گئے» پروفیسر عبد الباری نے جواب دیا کہ اللہ نے تمہارے ہی لئے مجھے بھیج دیا اس پر وہ سہم گیا اور اس کے بعد اس نے کچھ نہ کیا اور آہستہ ان کو ایک طرف جہاں دوسرے لوگ پڑے تھے پہنچا کر اپنا گھوڑا دوڑا لے گیا۔

یہ سلسلہ روزانہ چلتا رہا۔ ستیہ گرہی گرفتار ہوتے یا نہ

ہوتے لیکن جو بھیڑ جمتی اس پر وار ضرور ہوتا. کچھ لوگ گھائل بھی ہوتے. بھیڑ روز بروز بڑھتی ھی جاتی. مسٹر حسن امام بیرسٹر اور مشہور لیڈر تھے. کلکتہ ھائی کورٹ کی ججی کرچکے تھے. کانگریس کے پریسیڈنٹ بھی رہ چکے تھے. لیکن ستیہ‌گرہ میں وہ شریک نہیں ہوئے اس لئے پبلک ان سے ناراض بھی تھی. جس جگہ یہ مار پیٹ ہوا کرتی تھی وھاں سے ان کا مکان بہت دور تھا جسکی ان کو خبر بھی نہ تھی. ایک دن سویرے ان کی بیگم شہر سے لوٹ رھی ھیں. انہوں نے دیکھا کہ کس طرح لوگوں پر ڈنڈے برسائے جا رہے ھیں. کئی نوجوان کے سروں سے خون بہتے ہوئے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا. واپس جاکر سارا قصہ انہوں نے حسن امام سے بیان کیا اور کہا کہ کس طرح نہتے لوگ پیٹے جاتے ھیں اور پھر بھی پر امن رہتے ھیں اور مار کھاکر چلے جاتے ھیں. اس کا اثر مسٹر حسن امام کے دل پر بہت ھوا. انہوں نے ٹیلیفون کر کے مجھے بلایا اور سب حال بھی مجھ سے سنا. وہ بہت جذباتی آدمی تھے اس لئے وہ بہت غصہ اور جوش میں آگئے. مجھ

سے انہوں نے صاف صاف کہا کہ وہ مدد کرینگے. میں بہت خوش ہوا اور ان کو یقین دلایا کہ جہاں تک ہوسکے گا جنتا کی طرف سے کوئی بدامنی نہ ہونے پائے گی.

یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا. اس وقت تک «گڈفرائی ڈے» اور ایسٹر آ گیا. معلوم نہیں کیسے میرے دل میں خیال آیا کہ ہماری ستیہ گرہ ایك مذہبی تحریك ہے، اس کی وجہ سے کسی کو اپنی مذہبی پابندی میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑنی چاہئے: کیونکہ جتنے افسر تھے وہ انگریز اور عیسائی تھے اور سوار سب کے سب مسلمان. اس لئے میں نے سوچا کہ جمعہ کو مسلمانوں کی نماز جمعہ ہوتی ہے اور «گڈ فرائی ڈے» اور «ایسٹر» کے دوشنبہ کو عیسائی گرجا جاتے ہیں، اسلئے ان دونوں کا وقت بچا دینا چاہئے. میں نے ایك خط ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھ دیا کہ جمعہ کے دن دوپہر کو جس وقت مسلمان نماز پڑھتے ہیں ستیہ‌گرہیوں کا جتھا نہیں جائے گا تاکہ مسلمان سوار اگر چاہیں تو نماز ادا کرسکیں، اور کرسچین افسروں کے لئے بھی جو وقت گرجا جانے کا ہے اس وقت جتھا نہیں بھیجا جائے گا تاکہ وہ اپنا مذہبی فریضہ ادا کرسکیں

ان وقتوں کو چھوڑ کر دوسرے اوقات پر جتھا برابر جایا کرے گا.

یہ خط جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ملا تو اس نے مجھ سے ٹیلیفون پر کہا کہ وہ مجھ سے ملنا چاھتا ھے. اس کے لئے اس نے وقت بھی بتلایا. میں اس کے گھر پر گیا. جاتے ھی اس نے مجھ سے پوچھا کہ جو بات آپ نے لکھی ھے کیا سچے دل سے لکھی ھے؟ میں نے کہا ھاں میں نے تو سچے ھی دل سے لکھی ھے. اس پر اس نے کہا کہ میں انگریز اور عیسائی ھوں لیکن میں ان انگریزوں میں نہیں ھوں جو برابر تلوار چمکایا کرتے ھیں. میں چاھتا ھوں کہ کوئی ایسا راستہ نکلے کہ گورنمنٹ کا حکم قائم رھے اور جھگڑا بھی ختم ھو جائے. اتنا کہہ کر اس نے یہ کہا کہ «جس سڑك سے جتھے جایا کرتے ھیں اس راستہ کو چھوڑ کر اگر دوسرے راستے، جسے نیچے کی سڑك کہتے ھیں، جائیں تو ھم اسے جانے دیں گے». میں نے کہا «ایسا نہیں ھوسکتا، جتھے کو تو جانا ھی ھے اور اسی راستے سے جانا ھے جب تك اسے روکا جائے گا وہ جایا ھی کرے گا، لیکن اگر وہ

نہ روکا جائے تو یہ نہیں ھے کہ وہ ھمیشہ جاتا ھی رھے گا. اور اگر جایا بھی کرے گا تو وہ بھیڑ جو جمع ھوتی ھے نہیں ھوا کریگی. کیونکہ وہ بھیڑ جتھے کے لئے نہیں بلکہ پولیس کی کارروائی دیکھنے کے لئے جمع ھو جایا کرتی ھے.

اسی طرح کی باتیں ھوئیں. آخر میں کچھ طے نہیں ھوا اور میں چلا آیا. دوسرے روز جب جتھا گیا تو جو مار پیٹ بھیڑ کی ھوا کرتی تھی وہ نہیں ھوئی، صرف ستیہ گرھی گرفتار کئے جا کر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کئے گئے. اس کے بعد مجمع خود بخود چلا گیا. میں یہ دیکھنے کے لئے کہ ان ستیہ‌گرھوں کو کیا سزا ملتی ھے کچہری میں گیا. میں ابھی وھیں تھا کہ دوسرے جتھے کے جانے کا وقت آ گیا. وھاں خبر ملی کہ اگرچہ پولیس سڑک پر کھڑی تھی لیکن پھر بھی جب جتھا وھاں پہنچا تو اسے روکا نہیں بلکہ نکل جانے دیا. مجسٹریٹ نے مقدمہ میں ان کو اس وقت تک کے لئے قید کی سزا دی جب وہ خود اپنا کام ختم کرکے اجلاس سے نہ اٹھے. حکم سنا کر وہ فوراً اٹھ گیا. اس کے ساتھ ھی ستیہ‌گرھی بھی وھاں سے اٹھ کر باھر چلے گئے. اس کے بعد

ایک بار اور جتھا گیا لیکن پولیس نے اسکو نہ روکا. دوسرے روز روکنے کے لئے پولیس آئی بھی نہیں، ستیہ‌گرہ کی وہ شکل یہیں ختم ہوگئی. میں نے دیکھا پرامن ستیہ‌گرہ کا اثر ایک طرف جنتا پر پڑتا ہے اور دوسری طرف گورنمنٹ کی طرف سے جتنی زیادہ مار پیٹ ہوتی ہے اتنا ہی لوگوں کا جوش بڑھتا ہے. اس سے مار پیٹ کا ڈر کم ہوتا جاتا ہے. شروع میں بھیڑ پر جب ڈنڈے چلائے جاتے تو لوگ ادھر ادھر بھاگتے لیکن آہستہ آہستہ یہ بھگدڑ بھی بند ہوگئی. لوگ ڈنڈے کھا لیتے لیکن اپنی جگہ سے نہ ہٹتے. ادھر پولیس پر بھی اثر پڑے بغیر نہ رہتا. میں سمجھتا ہوں جو خط میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھا اس کا اسپر اتنا اثر ہوا کہ اس نے اس بات کو منہ سے کہے بغیر ستیہ‌گرہ کی جیت مان لی اور جلوس جانے دیا.

اس طرح کے واقعات کی خبریں چاروں طرف سے آتیں کہ جہاں جہاں نمک بنتا ہے وہاں پولیس کے لوگ پہنچتے ہیں اور نمک بنانے کے لئے جو ہانڈی اور برتن اکٹھا کئے جاتے ہیں ان کو وہ توڑ دیتے ہیں. کہیں کہیں مجمع کو پیٹتے بھی

ہیں لیکن بنانے والوں کو بہت کم گرفتار کرتے ہیں. نہ معلوم کیوں میں نہیں گرفتار کیا گیا. میں سبھی ضلعوں کا تیزی کے ساتھ چکر لگا رہا تھا. جب میں کسی ضلع میں پہنچتا تو وہاں ایک موٹر لیکر ایک کونے سے دوسرے تک دو دن یا زیادہ سے زیادہ تین دن میں دوڑ جاتا. راستہ میں جہاں جہاں نمک بنتا تھا، وہاں پہنچکر ان جگہوں کا بھی معائنہ کرلیتا اور ان لوگوں کو جوش دلا دیتا. اور دن بھر میں چھوٹی موٹی دس بارہ سبھائیں بھی کرلیتا. جوش اتنا تھا کہ سبھی لوگ اپنے اپنے گاؤوں میں مجھے لے جانا چاھتے تھے تاکہ میں دیکھ سکوں کہ ان کے یہاں بھی نمک بنایا جاتا ہے. سبھا میں جو نمک بنتا اسے میں کھلی جگہ پر نیلام کرتا، اس طرح تحریک کے خرچ کے لئے کچھ روپے بھی جمع کر لیتا. کیونکہ نمک کی ایک ایک پڑیا لوگ ۱۰ ۱۰ اور ۲۰ ۲۰ روپے میں لے لیتے. یہ سب ہوتے ہوئے بھی، جہاں تک مجھے یاد ہے، سارے صوبہ میں کہیں بھی جنتا کی طرف سے کوئی فساد یا بلوہ نہیں ہوا.

بیسواں باب

مہاتماجی کے عہد کو لوگ کتنی مضبوطی سے مانتے اور عزت کرتے تھے، اس کی ایك بہت روشن مثال بہپور (بھاگلپور) میں ملی. بہپور کا علاقہ گنگا کے کنارے ھے. گنگا کی دھار ادھر ادھر بدلتی رھتی ھے، جیسا کہ سبھی کناروں میں ھوا کرتا ھے. اسکی وجہ سے زمین کے نشان ھٹ جایا کرتے ھیں، اسی وجہ سے لوگ آپس میں اکثر یہ جھگڑا کرتے ھیں کہ کون زمین کس کی ھے. بہپور کے علاقہ میں ایك انگریز نے بہت سی زمین لے رکھی تھی، وھاں کے لوگوں سے زمین کے متعلق ایك بڑا جھگڑا چل رھا تھا. زمین کی حفاظت کے لئے اس نے گورکھوں کو تعینات کیا تھا. لوگوں سے یہ بات برداشت نہیں ھوئی، ایك دن سب لوگوں نے جمع ھو کر ان گورکھوں کو جو وھاں تعینات تھے مار ڈالا اور انکی لاشوں کو گنگا میں بہا دیا، یا ان کو اس طرح غائب کر دیا کہ کچھ پتہ ھی نہ چلا. اسی «بہپور» میں ستیہ گرہ چھڑ گئی.

سنہ ۱۹۲۹ع میں جب میں اس علاقہ میں دورہ کرنے گیا

اس وقت میں نے لوگوں میں بڑا جوش پایا. میں سمجھتا تھا کہ جب ستیہ گرہ چلے گی تو وھاں کے لوگ پورے جوش کے ساتھ اس میں شریك ھونگے. یہ اثر میرے دل پر ایك خاص وجہ سے ھوا تھا. جب میں اس علاقہ میں دورہ کر رھا تھا تو اس جگہ جلسہ کے لئے ایك یا دو بجے دن کا وقت دیا گیا تھا. میں وھاں سے کچھ دور دوسرے گاؤں میں چلا گیا تھا. مجھے امید تھی کہ میں وھاں ٹھیك وقت پر واپس آجاؤں گا. جس وقت میں واپس ھو رھا تھا تو اچانك بڑے زور کی بارش آ گئی، ھوا بھی چلنے لگی، میرے پہونچنے میں دو تین گھنٹہ کی دیر ھوگئی. جب میں وھاں بھیگتا ھوا پہونچا تو میں نے دیکھا، ایك بہت بڑا مجمع وھاں کھڑا ھے. میں نے سنا کہ وہ لوگ کئی گھنٹہ سے بارش میں میرا انتظار کر رھے ھیں. اس وقت بھی پانی برس رھا تھا. میں نے بارش ھی میں کھڑے ھو کر تقریر کی. جو کچھ کہنا تھا کہا. اسی بات سے میں نے سمجھ لیا کہ اس علاقہ میں ھمت و استقلال دونوں ھیں.

کچھ مہینوں کے بعد جب ستیہ گرہ شروع ھوئی اس وقت

وهاں بھی لوگوں نے ستیہ‌گرہ شروع کی. نمك کا قانون توڑنے کے ساتھ ساتھ شراب بندی اور نشہ والی چیزوں کے بائیکاٹ کا کام بھی ہو رہا تھا. وهاں گانجے کی ایك دوکان تھی. وهاں سے تھوڑی ھی دور پر ھم لوگوں کا آشرم اور وهاں سے تھوڑی دور پر ایك اسٹیشن اور ایك چھوٹا سا بازار اور نزدیك ھی ایك بنگلہ بھی تھا، اور وهاں سے تھوڑی ھی دور پر ایك تھانہ. والنٹیروں نے گانجے کی دوکان پر پہرہ لگایا. پولیس کو خبر لگی، اس نے آکر پہرہ والوں کو مارا پیٹا، جوش بڑھ گیا اور پہرہ زیادہ سختی سے ہونے لگا. ضلع کے افسروں کو خبر ہوئی. وهاں سے کچھ اور زیادہ پولیس کے آدمی آئے. ایك دن انہوں نے جا کر آشرم کے والنٹیروں اور کارکنوں کو وهاں سے زبردستی نکال دیا. جو کھادی اور سامان تھا اسکو لوٹا اور تتر بتر کر دیا. گانجا بیچنے والا یہ ھنگامہ دیکھ کر وهاں سے بھاگ گیا. اس طرح سے گانجے کی دوکان بند ہو گئی.

پولیس نے آشرم پر قبضہ کر کے وهاں اپنا اڈا جما لیا. ستیہ‌گرھی اب آشرم کو واپس لینے کے لئے ستیہ‌گرہ کرنے لگے. ستیہ‌گرہ کی شکل یہ ہوگئی کہ کچھ لوگ صرف جھنڈا ھی

ھاتھ میں لیکر آشرم کی طرف جاتے. پولیس ان کو وھاں جانے سے روکتی. روزانہ ایک جتھا جاتا. پولیس یا تو اس جتھے کی مار پیٹ کرتی یا سبکو گرفتار کر لیتی. جب گاؤں میں خبر پہنچی تو ستیہ گرہ کے وقت پر مجمع وھاں بھی جمع ھو جاتا. جب یہ بھیڑ بڑھنے لگی تو پولیس لاٹھیوں سے مار مار کر بھیڑ کو منتشر کر دیتی. کبھی کبھی ستیہ گرھیوں کو بھی پیٹتی. اور کبھی انہیں گرفتار کر کے آشرم میں ھی رکھ دیتی. پھر جب بھیڑ چلی جاتی تو انہیں نکال کر تھانے یا جیل خانے بھیج دیتی. یہ سلسلہ چلتا رھا. بھیڑ روزانہ بڑھتی رھی، یہاں تک کہ بیس بیس پچیس پچیس ھزار آدمی دور دور سے آتے اور لاٹھیاں کھا کر چلے جاتے. پولیس کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی. جیسے زبردست لڑاکا لاٹھی چلانے والے اس علاقہ کے لوگ ھوتے ھیں، ویسے لوگ اگر چاھتے تو باتوں ھی باتوں میں پولیس والوں کا صفایا کر دیتے. لیکن کسی نے کبھی اپنی زبان سے بھی ان کو چوٹ نہیں دی، لاٹھی چلانے کی تو بات کیا تھی.

میں ایک روز وھاں گیا. وہ مقام گنگا کے اتر بھاگلپور سے تھوڑی ھی دور پر ھے. بہپور اسٹیشن ایک برانچ لائن گنگا کے

کنارے تک جاتی ھے، جہاں سے اسٹیمر (جہاز) پر گنگا پار کر کے آدمی بھاگلپور پہنچ جاتا ھے. میں بھاگلپور ھی وھاں سے گیا، اس لئے بھاگلپور کے بھی کچھ لوگ ایسے ساتھ ھو گئے تھے جو ستیہ گرہ میں شریك ھونے والے تو نہ تھے، وھاں کا حال سنکر متاثر بہت ھوئے تھے. پٹنہ سے بھی کچھ لوگ ساتھ گئے تھے.

وھاں ھم لوگوں کے جانے کی خبر پہلے ھی پہنچ گئی تھی، اس لئے وھاں اس روز بھیڑ اور زیادہ ھو گئی تھی. پولیس سپرنٹنڈنٹ سپاھیوں کے ساتھ موجود تھا. وقت پر ستیہ گرھیوں کا ایك چھوٹا سا جتھا نکلا، اس وقت سڑك کے دونوں طرف مجمع کھڑا تھا. کچھ دور ایك جلسہ ھوا جہاں میں نے ایك چھوٹی سی تقریر کی. پولیس وھاں بھی موجود تھی مگر جلسہ میں کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں ھوئی. جب ستیہ گرھی آشرم کے پھاٹك کے پاس پہنچے تو وہ گرفتار کر کے آشرم کے اندر ھی لے جائے گئے. ھم لوگوں نے سمجھ لیا کہ آج اور کوئی خاص بات نہیں ھوگی، لیکن فوراً ھی پولیس سپرنٹنڈنٹ پندرہ لاٹھی والے سپاھیوں کے ساتھ نکلا اور اس نے حکم دیا

کہ «مارو». پولیس والے بے دھڑك مجمع پر لاٹھیاں چلانے لگے. کیونکہ مجمع سڑك کے دونوں طرف بہت دور تك پھیلا ہوا تھا، وہ لوگ دونوں طرف لاٹھیاں برساتے ہوئے آگے بڑھتے گئے. مجمع میں سے کسی نے نہ ہاتھ اٹھایا نہ بھگدڑی مچی. ہم لوگ کچھ دور تھے. کئی جگہوں پر آدمی پھیلے ہوئے تھے. سپرنٹنڈنٹ سپاہیوں کیساتھ پیٹتا پٹواتا وہاں بھی پہنچا جہاں میں کھڑا تھا. لاٹھیاں تو بے دھڑك چل ھی رھی تھیں، مجھ پر بھی لاٹھیاں پڑیں اور کچھ چوٹ بھی آئی. لیکن ایك دوسرے والنٹیر نے میرے اوپر لاٹھیوں کو نہ آنے دیا اور مجھ کو ڈھك لیا، اس لئے زیادہ چوٹ اسی کے آئی. پروفیسر عبد الباری تھوڑی ھی دور پر تھے. ان کو زیادہ چوٹ آئی، وہ چوٹ کھا کر گر پڑے اور ان کے خون بہنے لگا. یہ سارا معاملہ تھوڑی ھی دیر میں ختم ہوگیا. سپرنٹنڈنٹ اور سپاھی سارے مجمع میں لوگوں پر لاٹھیاں برساتے ایك طرف سے نکلے اور پھر آشرم میں چلے گئے.

میں نے سمجھ لیا کہ آج کا کام ختم ہو گیا. کیونکہ ایسا ھی روزانہ ھوا کرتا تھا. لوگ اپنی اپنی جگہوں کو روانہ ھو گئے.

ہم لوگ جو بھاگلپور سے آئے تھے وہیں ٹھرے رہے. ایک ڈاکٹر وہاں رہتے تھے. بھیڑ کے ہٹ جانے کے بعد وہ ہم لوگوں میں سے زخمیون کی مرہم پٹی کرنے لگے. ہم لوگ گھاس پر بیٹھے تھے اور گھاؤ دھوئے جا رہے تھے کہ اتنے میں پولیس کے سپرنٹنڈٹ اور انسپکٹر کچھ سپاھیوں کے ساتھ اسطرف آئے. ہم نے سمجھا شاید پھر ایک بار حملہ ہوگا، لیکن وہ لوگ کچھ دور پر ھی ٹھر گئے. پھر ہم لوگوں میں سے ایک آدمی گرفتار کر کے لے گئے. ہم لوگ گاڑی کا انتظار کر رہے تھے. اسی وقت کچھ لوگ جو ابھی گئے نہیں تھے ہمارے پاس آئے. وہ گاؤں کے رھنے والے تھے اور بہت ھی دکھی تھے. وہ مجھے گھیر کر بیٹھ گئے، بہت ھی پیچ و تاب میں کہنے لگے «یہاں ہم لوگوں میں آپ اور دوسرے نیتا اس طرح ہم لوگوں کے جیتے جی ھماری آنکھوں کے سامنے پٹے گئے اور ہم لوگ کچھ نہ کر سکے. اتنی پولیس کی کیا مجال تھی کہ ہم لوگوں پر ھاتھ اٹھاتی، آپ لوگوں کی تو بات ھی الگ ھے. لیکن ہم کیا کریں گاندھی جی نے ہم لوگوں کے ھاتھوں کو باندھ دیا ھے اسلئے ہم کچھ نہیں کرسکتے، نہیں تو اتنی پولیس

کو پیس کر ھم چٹنی کر دیتے، چاھے اسکا نتیجہ کچھ ھوتا.»
یہ کہکر سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے. میں نے ان کو بہت سمجھایا اور کہا، آپ لوگوں کی بہادری تو شانتی رکھنے ھی میں ھے، اسی سے آخر میں ھماری جیت ھوگی.

ھم لوگ جس گاڑی سے روانہ ھوئے اس سے کچھ پولیس کے سپاھی بھی بھاگلپور چلے، اسکا مطلب اسوقت ھم نہ سمجھے. دوسرے دن صبح ھم گنگا اشنان کرنے گئے. وھاں پولیس کے کچھ ھندو سپاھی بھی اشنان کرنے آئے تھے. انھوں نے پہلے دن کا حال سناتے ھوئے ھم سے کہا کہ «سپاھیوں میں دو پارٹیاں ھو گئی تھیں، جب سپرنٹنڈنٹ نے سب لوگوں پر لاٹھی چلانے کا حکم دیا اور خاص کر آپ جیسے لوگوں پر، تو ھم لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئی. اسلئے ھم میں سے کچھ نے صرف لاٹھی گھمائی اور ایسا دکھایا کہ ھم لاٹھیاں چلا رھے ھیں، لیکن کسی کو ھم لوگوں کی لاٹھیاں نہ لگیں. البتہ کچھ سپاھی ایسے تھے جنہوں نے خوب پیٹا. آپ لوگوں کے جب لاٹھی لگی اور عبد الباری صاحب بہت چوٹ کھا کر بیہوش ھو گئے اور گر پڑے، اس وقت ھم لوگوں سے یہ بات برداشت

نہ ہو سکی. ہم لوگوں نے ان سپاہیوں سے کہہ دیا کہ اگر تم لوگوں نے اسکے بعد لاٹھیاں چلائیں تو ٹھیک نہ ہوگا. لیکن وہ بھلا کیوں مانتے؟ انہوں نے پھر گرے ہوئے باری صاحب پر لاٹھیاں چلا ہی دیں. اس وقت ہم لوگوں نے اس لاٹھی کو اوپر ہی اوپر لاٹھی پر لے لیا اور ان سپاہیوں کو اپنی لاٹھی سے مارا. سپرنٹنڈنٹ تو آگے آگے چلتا تھا اور ہم لوگ اسکے پیچھے پیچھے اسی طرح لاٹھیاں چلاتے ہوئے چلے جا رہے تھے. اسلئے وہ خود تو نہیں دیکھ سکتا تھا کہ کس کے لاٹھی لگی اور کس کو مارا گیا. ہم لوگوں نے اس طرح باری صاحب کی جان بچالی اور ان سپاہیوں کو بھی پیٹا، اس وجہ سے ہم لوگوں کو ڈر ہوگیا تھا کہ وہ سپاہی ہم لوگوں کے خلاف شکایت کریں گے. چنانچہ مار پیٹ ختم ہوتے ہی ہم نے پہلے ہی صاحب سے نالش کردی کہ ان سپاہیوں کو لاٹھی چلانی نہیں آتی، یہ لوگ اس طرح لاٹھی چلاتے ہیں کہ مجمع کو چھوڑ کر آپس ہی میں چوٹ کھا جاتے ہیں. اس پر ان سپاہیوں نے بھی کہا کہ یہ سب غلط بات ہے. ان لوگوں نے ہم کو ہی مارا ہے، ہم کو لاٹھیاں چلانے سے بھی

روکا اور خود تو انہوں نے کچھ کیا ھی نہیں. صاحب نے یہ سنکر اور تو کچھ نہیں کیا، البتہ ہم لوگوں کو رات ھی بھاگلپور واپس کر دیا. ہم لوگ اسی گاڑی سے آئے ھیں جس سے آپ لوگ رات کو آئے.»

ہم نے دیکھا کہ پولیس کے سپاھیوں کو بھی ستیہ گرھیوں کے ساتھ ھمدردی ھے. وہ جہاں تك سختی کرنے میں اپنے کو مجبور سمجھتے تھے وھیں تك سختی کرتے تھے اور نوکری چھوڑنے کیلئے تیار نہ تھے، لیکن ستیہ گرھیوں کے ساتھ زیادتی بھی نہیں کرنا چاھتے تھے. یہ بات افسروں میں نہیں تھی، اگرچہ ان میں بھی کچھ اچھے تھے. اس قسم کا مجھے وھیں ایك اور سکھ دینے والا تجربہ ھوا.

میں نے اوپر ذکر کیا ھے کہ ہم لوگ بیٹھ کر مرھم پٹی کرا رھے تھے تو ایك پولیس کے انسپکٹر بھی سپرنٹنڈنٹ اور سپاھیوں کیساتھ آئے تھے اور ہم لوگوں میں سے ایك کو گرفتار کر کے لے گئے تھے. میں نے اس وقت تك ان کو پہچانا نہیں تھا، بعد میں پوچھنے پر ان کا نام معلوم ھوا. مجھے یاد آ گیا کہ میرے اسکول میں اسی نام کے ایك میرے

هم سبق بھی تھے جو پولیس میں کام کرتے ھیں. میں نے بھاگلپور سے بہپور ایک آدمی کو اسلئے بھیجا کہ وہ جا کر اس کھادی، سوت وغیرہ کو جس کو پولیس نے لے لیا ھے واپس لے آئے، کیونکہ چرخہ سنگھ کے خلاف کوئی حکم نہیں تھا. وہ جاکر ان سے ملا، باتیں کرتے کرتے اس نے یہ ذکر بھی چھیڑ دیا کہ میں نے بات چیت میں یہ کہا تھا کہ اسی کے نام کے ایک آدمی اسکول میں میرے ساتھی تھے جو پولیس میں ھیں، لیکن آپ کو کل شام کے وقت وھاں پہچان نہ سکے. یہ سنتے ھی پولیس انسپکٹر گھبرا گیا اور اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے. اس نے بات بدلنی چاھی اور کہا کہ «آپ یہ سب باتیں نہ کہئے، کھادی کی بات چیت کیجئے» لیکن چرخہ سنگھ کا وہ آدمی بہت ھی ھوشیار بولنے والا تھا. اس نے پھر کھادی کی بات چیت کر کے میرا نام لے لیا. اس وقت اس نے دیکھا کہ انسپکٹر پھر بیچین ھو گیا.

یہ باتیں اسنے آ کر مجھ سے کہیں. میں سمجھ گیا کہ نوکری کی وجہ سے بہت سے لوگ دیکھنے میں ھمارے مخالف معلوم ھوتے ھیں لیکن انمیں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں ستیہ گرھیوں

کے بارے میں اعتقاد اور محبت ھے. ھم نے دیکھا کہ مہاتماجی کی اھنسا کس طرح مخالفوں کے دلوں میں اثر کرتی ھے.

وھاں کے مجسٹریٹ ضلع ایك ھندوستانی مہربان تھے. انکے بڑے بھائی عدم تعاون میں ھم لوگوں کیساتھ بہت کام کر چکے تھے اور وہ جیل بھی گئے تھے. وھاں وہ بہت سخت بیمار پڑے. جب حالت زیادہ خراب ھوئی تو گورنمنٹ نے انہیں چھوڑ دیا. لیکن جیل سے نکلتے ھی ان کا انتقال ھو گیا، اسلئے ان کے سارے کنبہ کیساتھ میرا بہت گہرا تعلق ھو گیا تھا. مجسٹریٹ ضلع تو نوکری میں تھے، ان سے کوئی ملاقات نہیں تھی. جب میں بہ‌پور سے بھاگلپور لوٹا تو انہوں نے ایك دوست کے ذریعہ میرے پاس پیغام بھیجا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے بہت مشتاق ھیں، لیکن نوکری کیوجہ سے ان کی جو حالت ھے اسمیں علانیہ ملنا مناسب نہیں ھے. اگر اس دوست کیساتھ ان کے گھر آ جاؤں تو وہ بہت ممنون ھوں گے. میں سن چکا تھا، اگرچہ وہ ضلع مجسٹریٹ تھے لیکن پھر بھی ان کی کچھ چلتی نہیں تھی. بھاگلپور ڈویژن کا کمشنر بھاگلپور ھی میں رھا کرتا تھا. وہ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس

مل کر ستیہ گرہ کے سیلاب کو روك رہے تھے.

میں اس دوست کے ساتھ رات کو مجسٹریٹ کے گھر گیا. جوں ھی میں وھاں پہونچا وہ میرا پیر پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور کہنے لگے کہ «آپ میرے بڑے بھائی کے مانند ھیں، کیونکہ آپ ان کے ساتھی ھیں، آپ دونوں کا گہرا دوستانہ تھا. میں جانتا ھوں یہاں میں مجسٹریٹ ضلع ھوں اور اس لئے یہ سمجھا جاتا ھے کہ یہاں جو کچھ ھوا ھے میرے ھی حکم سے ھوا. میرے مجسٹریٹ رہتے ھوئے یہاں آپ اور دوسرے نیتا اسطرح لاٹھیوں سے پیٹے گئے. لیکن یہ سب میرے حکم کے خلاف ھوا اس میں میرا کوئی ھاتھ نہیں ھے».

میں انکو کچھ اطمینان دلا کر واپس چلا آیا.

بھاگلپور کپڑے کے بیوپار کا بہت بڑا مرکز ھے. ان دنوں بہار بھر میں بدیشی کپڑے کی سب سے بڑی منڈی وھیں تھی. بہپور کے مندرجہ بالا واقعہ کا ایك نتیجہ یہ ھوا کہ سارے شہر اور بیوپاریوں میں بہت جوش پھیل گیا. ایك دو دن کے اندر ھی سب نے بدیشی کپڑے کی فروخت بند کر دینے کا وعدہ کیا. چنانچہ جو کپڑا ان کے پاس تھا

انہوں نے سبکو بند کر کے کانگریس کی مہر لگوادی اور کہا بھی کہ جب تک کانگریس کا پھر حکم نہ ہوگا ہم یہ کپڑے نہ بیچیں گے. وھاں بھی کچھ عورتیں تیار ہوئی تھیں اور انہوں نے کہا کہ ہم بدیشی کپڑے کی دوکانوں پر پہرہ دینگے. لیکن اسکی زیادہ ضرورت پیش نہیں آئی، ساری گانٹھیں مذکورہ بالا واقعہ کی وجہ سے فوراً بندھہ گئیں اور اسپر مہریں لگ گئیں. بہپور کے لوگوں کا جوش عارضی نہیں تھا. چنانچہ جب تک ستیہ گرہ جاری رھی اور گاندھی - ارون سمجھوتہ کے مطابق ستیہ گرہ بند نہ ہوئی اسوقت تک ستیہ گرھیوں کا جتھا روزانہ جاتا ھی رہا. کچھ دنوں کے بعد پولیس نے مجمع پر لاٹھی چلانی بند کردی، اسلئے مجمع بھی کم ھوتا گیا. لیکن جو ستیہ گرھی جاتے ان کے ساتھ بہت سختی ھوتی. مار پیٹ کے علاوہ ان کو طرح طرحکی تکلیفیں دی جاتیں. ایک لڑکے کے کان میں سائکل کا پمپ لگا کر اتنے زور سے ھوا دی گئی. کہ اسکے کان کا پردہ پھٹ گیا، چنانچہ وہ آجتک اس کا نتیجہ بھگت رہا ھے. لیکن لوگ اور ستیہ گرھی برابر نڈر ھوکر اپنا کام کرتے ھی رھے.

اکیسواں باب

ستیہ گرہ شروع ہوئے دو ماہ سے زیادہ گزر چکے۔ لیکن ابھی تک نہ تو میں گرفتار ہوا اور نہ پنڈت موتی لال نہرو گرفتار ہوئے۔ اگرچہ ہم دونوں ہی ستیہ گرہ کا کام بہت زوروں سے چلا رہے تھے۔ پنڈت جی الہ آباد میں بیٹھکر سارے ملک کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ ورکنگ کمیٹی کی بیٹھک بھی کبھی کبھی ہوا کرتی اور میں وہاں جایا کرتا۔ لیکن زیادہ وقت اپنے صوبہ کے ضلعوں ہی میں دورہ کرنے میں لگاتا تھا۔ تعجب ہوتا تھا کہ میں کیوں نہیں گرفتار کیا جاتا! کچھ دنوں تک تو صوبہ کی حکومت کا حکم تھا کہ میں گرفتار نہ کیا جاؤں۔ اسلئے ضلع کے حاکم مجھے گرفتار نہیں کرتے تھے۔ میں اکیلا چکر لگایا کرتا تھا۔ کچھ دنوں بعد مجھے خبر ملی کہ جو ممانعت میری گرفتاری کے بارے میں ہوئی تھی، وہ اٹھا لی گئی، اگر مجسٹریٹ ضلع چاہے تو مجھے گرفتار کر سکتا ہے۔ گرفتاری کے حکموں کی خبر مجھے پولیس افسر ہی دیا کرتے تھے۔ جس نے ممانعت اٹھا دینے کی خبر

دی اس نے یہ بھی کہا کہ میں اکیلا سفر نہ کیا کروں، ایک آدمی ضرور ساتھ رکھا کروں، تا کہ گرفتار ہونے پر وہ سبکو خبر دے سکے. میں لاپروائی سے اپنا کام کرتا ہی گیا. اس کے بعد خبر ملی کہ صوبائی حکومت کا حکم ضلع مجسٹریٹ کو پہونچگیا کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں. یہ خبر تو ملی مگر میں کئی ضلعونمیں پھر کر آ گیا. کہیں گرفتاری نہیں ہوئی. میں نے اس کا یہ سبب سنا کہ حکام ضلع سمجھتے تھے کہ میری گرفتاری سے بہت ہنگامہ ہو جائیگا، اور یہ بلا کوئی مجسٹریٹ ضلع اپنے سر لینا نہیں چاہتا تھا، اور ایسا کرنے کا ان کو پورا موقع بھی نہیں ملتا تھا. کیونکہ میں اتنی تیزی سے ایک ضلع سے دوسرے ضلع نکل جاتا کہ وہ سوچتے ہی رہتے اور میں دوسرے ضلع میں چلا جاتا.

آخر میں میں اپنے ہی ضلع «سارن» جہاں کا میں رہنے والا تھا، پہونچا. وہاں سخت حکم گیا کہ مجھے ضرور پکڑ لیا جائے. کیونکہ اسی ضلع کا رہنے والا ہوں، اسلئے یہ اسی ضلع کے مجسٹریٹ کی خاص ذمہ داری ہے. وہاں کی پولیس تو اس تاک میں تھی لیکن دو دن تک مجھے پکڑ نہ سکی.

میں کچھ چھپکر نہیں جاتا تھا ، اور نہ کہیں اپنے بچانیکی تدبیر کرتا تھا. لیکن میرا کوئی پروگرام مقرر نہیں ھوتا تھا اور نہ یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ میں کہاں جاؤنگا. دو دن کے سفر کے بعد مجھے «چھپرا» میں رات کو ٹھہرنا تھا. وھاں میرے بھائی صاحب کیساتھ گھر کے سب لوگ رھتے تھے. راتکو تقریباً دس گیارہ بجے تک پولیس والے میرا انتظار کرتے رھے. لیکن جب میں نہیں ملا ، تو وہ سمجھے کہ میں کسی دوسری جگہ چلا گیا. اس کا پتہ لگانے کیلئے وہ اور دوسری جگھوں پر گئے. کئی گاؤنمیں پھرتے پھرتے مجھے دیر ھو گئی تھی ، اس وجہ سے میں رات کے گیارہ بجے کے بعد پھونچا. دوسرے دن مجھے جدھر جانا تھا ، ادھر ھی پولیس والے جاکر میرا انتظار کرنے لگے. میں رات بھر چھپرا میں رہ کر سویرے جہاں مجھے جانا تھا ، وھاں کیلئے روانہ ھو گیا. ابھی شہر کے اندر ھی تھا کہ راستہ میں پولیس والے مل گئے اور میں گرفتار ھو گیا. انھوں نے اتنا اخلاق کیا کہ مجھے میرے گھر پر لیگئے ، وھاں سب سے ملا کر انھوں نے مجھے «چھپرا». جیل میں پھونچا دیا.

یہ میرا جیل جانے کا پہلا ھی تجربہ تھا. جب میری گرفتاری کی خبر شہر میں پھیلی تو لوگوں نے ایك جلوس نکال کر، شہر میں مظاھرہ کیا. جیل میں اس وقت تین چار سو ستیہ گرھی تھے. جیسے ھی میں جیل کے پھاٹك کے اندر پہونچایا گیا، ستیہ گرھیوں کو اس کا پتہ چل گیا. وہ وھاں شور و غل مچانے لگے اور نعرہ لگاتے ھوئے جیل کے پھاٹك کے نزدیك آ گئے. میں وھیں جیلر کے کمرے میں بیٹھا ھوا تھا کہ شہر کا جلوس بھی جیل کے نزدیك چلا آیا. جیل کے اندر سے لوگ نعرہ لگاتے تھے، اور چاھتے تھے کہ جیلر ان کو جلد موقع دے تاکہ وہ میرا استقبال کریں، لیکن ادھر باھر کی بھیڑ اور اندر کے شور و غل سے گھبرا کر جیلر نے اپنے سپاھیوں کو حکم دے دیا کہ بندوقوں سے جھوٹا فائر کرو. باھر کا جلوس جیل کے احاطہ کے باھر کی سڑك پر جا رھا تھا. جیلر نے اپنی گھبراھٹ میں وہ حکم دیدیا تھا. جب اندر کے لوگوں نے بندوق کی آواز سنی تو وہ سمجھے کہ باھر کے لوگوں پر گولی چل گئی. وہ اب اس پر اور بھی طیش میں آ گئے. میں نے جیلر سے کہا مجھے ایك بار اندر جانے دو تو سکون

ہو جائیگا. لیکن جب تک باہر شور و غل تھا، وہ پھاٹک کھولنے سے ڈرتا تھا. آخر میں جب اس نے دیکھا کہ بغیر اس کے کام نہیں چلے گا، تو اس نے مجھے کھڑکی سے کچھ کہنے کا موقع دیا. نتیجہ یہ ھوا کہ سب چپ ہو گئے. گرفتاری کے وقت میرے بھائی صاحب چھپرہ میں نہیں تھے میرا مقدمہ دھلی میں ھوا اسی وقت وہ آئے اور ان سے ملاقات ہوئی. چھ ماہ کی سزا سنائی گئی. کچھ ایسا اتفاق ھوا کہ دو بار، ایک بار چھپرہ میں اور ایکبار پٹنہ میں، مجھے سزا دینے والے مجسٹریٹ پرانے ملاقاتی ھی نکلے، جو وکالت کے زمانہ میں میرے موکل رہ چکے تھے، اور ان کے مقدمہ کی پیروی میں نے ھائیکورٹ میں کی تھی. سزا تو انہوں نے ضرور دی لیکن میری طرف سر اٹھا کر مجھے کبھی نہ دیکھا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایک پنجابی مسلمان تھے.

ہزاری باغ جیل میں دوسرے بہت سے ستیہ گرھی رکھے گئے تھے. بہت ھی خفیہ طور سے میں بھی وھیں بھیجا گیا تاکہ راستہ میں کہیں گڑبڑ نہ ھونے پائے. چھپرا سے ہزاری باغ سیدھے راستے سے جانے میں پٹنہ اور گیا دو بڑے شہر

پڑتے تھے. گنگا پار کرنیکے لئے سون پور جیسے بڑے اسٹیشن پر گاڑی بدلنا پڑتی. اسٹیمر سے گنگا پار کرنی پڑتی. ان سب جگہوں پر مظاہرہ کا کافی موقع تھا. اس وجہ سے چپ چاپ بہت چکر دیکر بنارس کے راستہ سے تقریباً ڈیڑھ سو میل موٹر کا سفر کرا کے کسی طرح مجھے هزاری باغ پہونچایا گیا. جب تک میں وهاں جیل میں داخل نہ ہو گیا، کسی کو پتہ نہ لگا کہ میں کہاں بھیجا گیا ہوں اور کس راستے سے؟ چھپرہ جیل کے افسروں کو بھی اسکا پتہ نہ تھا. کیونکہ مجسٹریٹ کے ملنے کے بہانے سے جیل کے پھاٹک پر بلایا گیا. جہاں دسٹرکٹ مجسٹریٹ اپنی موٹر لیکر تیار تھا، وهاں میں جس حالت میں پہونچا اسی حالت میں بغیر سامان لئے ہوئے وہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہو گیا. جب گاڑی شہر سے باهر نکل گئی اس وقت مجھ سے کہا گیا کہ میں کہاں اور کس راستے سے هزاری باغ جیل لیجایا جا رہوں. جیل کے اندر خبر ہوتے ہی کہ میں کہیں دور لیجایا گیا، لوگوں نے شور مچانا شروع کیا. دو منزلوں سے انہوں نے چلا چلا کر سڑک پر چلنے والوں کو سنایا کہ میں نمعلوم کہاں اور کس نا معلوم مقام

پر لیجایا گیا ہوں۔ میرے بھائی سمجھ گئے کہ ہزاری باغ ہی سبلوگ لیجائے جاتے ہیں، اس لئے مجھے وہیں لیگئے ہونگے۔ اسی وجہ سے وہ موٹر سے «سون پور» اسٹیشن گئے کہ کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جائیگی۔ لیکن میں اس راستہ سے ہی نہیں گیا تھا۔

ہزاری باغ پہونچ جانے کے بعد دسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھائی صاحب کو اطلاع دی۔ اسنے مجھ سے موٹر ہی میں بہت معافی مانگ کر کہا کہ «نوکری میں بہت سے ایسے کام کرنا ہی پڑتے ہیں۔ نوکری چھوڑ نہیں سکتا۔ اسلئے سب کام کرنا پڑتے ہیں۔ لیکن ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ آپ کو یہاں سے وہاں تک کوئی تکلیف نہ ہوگی»۔ یہی ہوا، مجھے تکلیف نہیں ہوئی، جو پولیس افسر ساتھ گئے تھے وہ سبھی اچھا برتاؤ کرتے رہے۔ میں موٹر میں جا رہا تھا اور راستہ ضلع گیا کے شہر اورنگ آباد سے ہو کر تھا۔ موٹر ڈرائور کو حکم تھا کہ شہر میں بڑی تیزی سے نکل جانا، جسمیں کوئی پہنچان نہ سکے۔ جو پولیس کا افسر ساتھ تھا اس نے کہا کہ «نزدیک ہی انوگرہ بابو کا گھر ہے، وہ بیمار ہیں، اگر آپ ملنا چاہتے ہیں تو میں

ان کے گھر چل کر ملاقات ضرور کرا دیتا ، لیکن شاید اس گاڑی کے پیچھے پیچھے سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی اپنی موٹر سے آرہا ھے اسلئے میں وھاں لیجانے سے ڈرتا ھوں» . میں نے کہا «انوگرہ بابو کا گھر میں بھی جانتا ھوں اور یہ بھی معلوم ھے کہ وہ بیمار ھیں ، لیکن آپ قاعدہ کے خلاف کچھ نہ کریں، مجھے ملنا نہیں ھے» .

بائیسواں باب

مجھے افسوس ھے کہ آھستہ آھستہ جیل کے بہت سے افسروں کا رخ بدل گیا. کچھ تو شروع ھی سے دوسرے خیال کے تھے. لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو ستیہ گرھیوں کو پہلے بڑے عقیدے کی نگاہ سے دیکھتے تھے، وہ بھی ایک طرح سے اب لا پرواہ سے ھو گئے. جس کا سبب کچھ تو ستیہ گرھیوں کی غلطیاں تھیں. مہاتماجی نے بار بار جتایا تھا کہ قانون توڑ نے کا اسکو ھی اختیار ھو سکتا ھے جو قانون کی پابندی اچھی طرح کر سکتا ھے. اس کا مطلب یہ ھے کہ جو شخص یونہیں قانون توڑا کرتا ھے وہ ستیہ گرہ کے جذبہ سے قانون نہیں توڑ سکتا، کیونکہ وہ تو معمولی طور سے بھی توڑا کرتا ھے. ستیہ گرہ کا جذبہ نہ تو اس کے دل میں ھوگا اور نہ دوسروں پر اس کا اثر ھوگا. اسلئے انھوں نے بتایا تھا کہ جیل کے اندر سبھی قاعدوں کی پابندی کرنی چاھئے، بجز ایسے قاعدوں کے جن سے خودداری کو ٹھیس لگتی ھے. اس طرح کا ایک قانون تھا جس کے متعلق سنہ ۱۹۲۱ع سے ھی

کانگریسی لوگ لڑتے چلے آئے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ع میں بھی وہ خواہ جیل کی کتابو نمیں کیوں نہ ہو ستیہ گرھیوں کیساتھ وہ وہ نہیں برتا جاتاتھا۔ وہ قانون یہ تھا کہ جب کوئی بڑا افسر آتا تھا اسوقت سب قیدیوں کو قطار میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اسکے بعد ایک سپاہی کے «سرکار سلام» کہنے پر سبکو اپنا ایک ہاتھ پورا پنجہ کھول کر دکھانا پڑتا تھا، اور دوسرے ہاتھ سے ہونٹ کھول کر دانت دکھانے پڑتے تھے۔ اسمیں ایک تو برٹش گورنمنٹ کے وجود کو سلامی دینی پڑتی تھی اور دوسرے ایک غریب آدمی کی طرح دانت کھولنے پڑتے تھے۔ اسطرح کے قانون بننے کا سبب کچھ ہو، یہ بات بہت بری اور بے عزتی کی معلوم ہوتی تھی، اسلئے اسکی عملی شکل میں سنہ ۱۹۲۱ع ہی سے مخالفت شروع ہو گئی تھی۔ اسکو نہ ماننے کی وجہ سے ستیہ گرھیوں کو بہت قسم کی تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ آخر میں ایسا ہو گیا کہ جب تک جیل کے افسر ستیہ گرھی قیدیوں سے جھگڑا کرنے کا ارادہ نہیں کرتے تھے «سرکار سلام» نہیں کہتے۔ گویا ایسا کہنے ہی سے طیش پیدا ہو جاتا تھا۔ دوسرے قانون بھی جو کچھ بے عزتی کے حامل

ہوتے تھے، کچھ ایسے ڈھیلے ہو گئے تھے کہ ستیہ گرھیوں کو بہت سی جیلوں ھی سے چھٹکارا مل گیا. جہاں نہیں ملا تھا وھاں کچھ نہ کچھ جھگڑا ضرور ہو جاتا تھا. لیکن ستیہ گرھی صرف ایسے ھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے، جنکی خلاف ورزی کرنی مہاتماجی نے جائز قرار دی تھی. بلکہ وہ دوسرے قانونوں کی بھی مخالفت کیا کرتے تھے، جن سے اپنا کردار یا کیرکٹر کمتر ہوتا جاتا رھا. ایک معمولی قانون چٹھیوں، اخباروں، یا کتابوں کے منگانے کے متعلق تھا. اس قانون کے خلاف ھم میں سے اکثر لوگ یہ چیزیں کسی نہ کسی طرح سے منگاتے تھے، اور وہ لوگ بھی کسی نہ کسی طرح گھر چٹھیاں بھیج دیتے. یہ کام ایسے تھے جو غیر مناسب تھے. جیل کے افسران اور سپاھی بھی ستیہ گرھیوں کی اسمیں مدد کیا کرتے. کیونکہ ان میں جو اچھے تھے وہ یہ مانتے تھے کہ ایسا کرنے سے ھم ایک قسم کی خدمت ھی کر رھے ھیں. اور جو برے تھے وہ شاید ان کمزوریوں کی خبر دوسرے افسروں تک پہونچا دیتے تھے. اس کا ایک نتیجہ تو یہ دیکھنے میں آیا کہ کچھ تو ان چھوٹی موٹی مہربانیوں کیلئے

افسروں کی خوشامد بھی کرتے. اگر کسی ستیہ گرھی کے ساتھ افسروں کا بہت زیادہ ربط ضبط ہو گیا تو اسکی وجہ سے ستیہ گرھیوں میں آپس میں اختلاف ہو جاتا. جو ھوشیار افسر تھے، اسطرح کتنی بھی خدمت کیوں نہ کردیں، ایسے خدمت چاھنے والے ستیہ گرھیوں کے بارےمیں وہ عزت نہیں رہ جاتی تھی. اس طرح سے بہت سے لوگوں کے بارے میں انکا عقیدہ جو شروع میں ھوا تھا، کم ھو جاتا.

ھماری کمزوری دوسری طرح سے بھی ظاھر ھوتی. جیل کے افسروں کیساتھ کھانے پینے کی چیزوں کیلئے بھی کبھی جھگڑا ھوجاتا. مگر اس سے زیادہ بری بات یہ تھی کہ آپس میں بھی اس معمولی بات کیلئے کبھی کبھی جھگڑے ھوجاتے. اسی سال جیلوں میں ایك نیا قانون جاری ھوا، جس کے مطابق قیدی تین حصونمیں بانٹ دئے گئے. جو سب سے اونچے یعنی اے "A" درجہ کے تھے، ان کیلئے کھانے پینے، ملاقات، اور چھٹیوں کی زیادہ آسانی تھی، انکو اپنے کپڑے پہننے کا حق تھا، کام کرنے سے بری تھے. جو دوسرے یعنی بی "B" کلاس کے تھے، ان کو کھانے پینے کی تو وھی آسانی

تھی جو اے کلاس والوں کو تھی، لیکن چٹھیوں اور ملاقاتوں کی آسانی اے کلاس کے مقابلہ میں کم تھی، جیل کے کپڑے پہننے پڑتے۔ اور جنکو سخت سزا ملتی وہ کام کیلئے بھی مجبور تھے۔ تیسرے درجہ سی "C" کلاس کیلئے پہلے دو درجوں کے مقابلہ میں کھانے پینے کی اور دوسری سب آسانیاں بہت کم تھیں۔ یہ تقسیم کسی اصول کی بنیاد پر نہیں کی گئی تھی، بلکہ قیدی کے جیل جانے سے پہلے اس کے رہن سہن اور اسکی عزت وحیثیت کی بنیاد پر کی گئی تھی، جس میں سیاسی قیدی اور دوسرے قیدیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا۔ ایسے قیدی بھی جو فریب، جعلسازی اور چوری تک کی سزا پائے ہوئے تھے، لیکن جنکو بی "B" کلاس مل گیا تھا، ان سبھی آسانیوں کو حاصل کئے ہوئے تھے جو بی کلاس کے سیاسی قیدیوں کو ملی ہوئی تھیں۔

مہاتما جی نے کہا کہ سیاسی قیدیوں کی الگ تقسیم کی جانی مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ جب ہم جیل خانے جاتے ہیں تو ہمکو اور قیدیوں کی طرح سے ہی اپنے تئیں سمجھنا چاہئے۔ اور جو دوسرے قیدی سکھ اور دکھ برداشت کرتے ہیں

وهی همکو بهی برداشت کرنا چاهئے. اسلئے که جو دوسرے قیدی هونگے، ان کے ساتهہ هماری همدردی هوگی اور ان کی همدردی همارے ساتهہ. یه ممکن هے که جیل کے افسروں کا جو برتاؤ معمولی قیدیوں کیساتهہ بہت سخت هوا کرتا هے، وہ هم لوگوں کی وجه سے کچهہ بدل جائے. اور جو آسانیاں هملوگوں کو ملیں، وهی معمولی قیدیوں کو بهی ملنے لگیں. اگر همارا کردار ٹهیك رها تو کچهہ اچها اثر معمولی قیدیوں پر بهی پڑ سکتا هے. مهاتما جی کو امید تهی که اس طرح جیل کے اندر بهی هم اپنے اچهے اصول اور پاکیزہ چال چلن سے معمولی قیدیوں کی کچهہ خدمت کر سکیں گے. ممکن هے که جیل میں هماری وجه سے بہت کچهہ اصلاح هو جائے. اسطرح سے هم لوگوں پر بهی اچها هی اثر پڑےگا، کیونکه هم اپنے تئیں عوام میں هی سمجهتے رهیں گے. ملك کی خدمت کا گهمنڈ هم پر برا اثر نہیں کریگا، اور جیل کے افسروں پر اسکا اچها اثر پڑےگا.

لیکن یه باتیں همارے لوگوں کی سمجهہ میں نہیں آئیں. ان میں تو همیشه ایك هی بات کا چرچا رها، که سیاسی قیدی

دوسرے معمولی قیدیوں سے الگ سمجھے جائیں اور ان کی تقسیم الگ کی جائے. اسوقت برٹش گورنمنٹ نے اسکو اصولی طور پر نہیں مانا، لیکن برتاؤ میں سیاسی قیدی الگ سمجھے جانے لگے. اس کا ایك سبب یه بھی تھا که جیل کے افسر ڈرتے تھے که ستیه گرھی معمولی قیدیوں کو بھی بگاڑ دیں گے، جیلونمیں ان سے بھی بغاوت کرائیں گے. اس وقت ان کیلئے معمولی قیدیوں کو حکم کا پابند رکھنا مشکل ھو جائیگا. اسی خیال سے ستیه گرھیوں کیساتھ جھانتك ھو سکتا، معمولی قیدیوں کا بہت کم ربط ھونے دیا جاتا. جب سیاسی قیدیوں کی تعداد بڑھی تو ان کیلئے الگ جیل خانے قائم ھو گئے، کچھ نئے اور کچھ پرانے، جن میں صرف سیاسی قیدی رکھے جاتے ھیں. اگر کسی جیل خانے میں دونوں قسم کے قیدی رھتے، تو وہ الگ صحنوں میں رکھے جاتے، تاکه ان کو ایك دوسرے سے ملنے کا کم سے کم موقع ملے. اس طرح دوسرے قیدیوں سے ستیه گرھی اکثر الگ ھی رکھے جاتے رھے. کہیں کہیں ستیه گرھیوں اور دوسرے قیدیونمیں جھگڑا بھی ھوا، لیکن بہت کم. اتنا ضرور ھوا که

جو اثر هم اپنی ملاقات اور اچھے چلن سے معمولی قیدیوں پر ڈال سکتے تھے، اتنا نہیں ڈال سکے. اسمیں هماری اپنی تو کمزوریاں تھیں هی، مگر جیل کی بھی کچھ ایسی هی پالیسی تھی.

تقسیم کا ایك دوسرا اثر جو ستیہ گرهیوں پر پڑا وہ بہت برا تھا، کیونکہ اس سے آپس میں نفاق پیدا هو جاتا تھا. ستیہ گرهیوں کی خواهش تھی کہ وہ اے "A" یا بی "B" درجہ میں رکھے جائیں. اسکے لئے وہ خود یا ان کی طرف سے دوسرے لوگ جیل کے اندر یا باهر افسروں کے پاس پهونچکر کوشش کرتے. اگر کسی کو اے کلاس مل جاتا تو کچھ لوگ ایسے بھی هوتے جو اسکو برا مانتے اور حسد کرتے. اور جنکو اوپر کا درجہ مل جاتا تھا انمیں سے کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے تئیں سی "C" کلاس والوں کے مقابلہ میں بڑا سمجھتے، کچھ گھمنڈ بھی کرتے. یہ آپس کا نفاق اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا، جب «سی» کلاس کیساتھ اے کلاس اور بی کلاس کے سیاسی قیدی ساتھ هی رکھے جاتے تھے. لیکن افسروں نے دونوں کو اپنی آسانی کے خیال سے الگ الگ رکھا. اسلئے جھگڑا اس حد تك نہیں بڑھا جهانتك

بڑھ سکتا تھا. ان سب اسباب کا یہ نتیجہ تو ضرور ہوا کہ ہم سیاسی اثر جتنا جیل کے افسروں پر ڈال سکتے تھے، نہ ڈال سکے.

ستیہ گرھیوں کو جیل کا تجربہ کافی ہوا. جب ہمارے هاتھونمیں اختیار آیا تو ہم کو جیلونمیں اصلاح کرنے کا اب موقع ھے اور ہم اپنے تجربوں سے فائدہ اٹھا سکتے ھیں. میں نے دیکھا کہ جیل کے جتنے قانون بنے ھیں سب تجربوں ھی سے بنے ھیں. چھوٹی چھوٹی باتیں جن کا مطلب پہلے سمجھ میں نہیں آتا تھا، کچھ مطلب رکھتی ھیں، جو تجربہ پر منحصر ھے. میں نے دیکھا کہ جیل کا ایک سپاھی سہ پہر کو تین چار بجے کے قریب لوھے کی ایک چھوٹی سی سلاخ لیکر دروازوں اور جنگلونمیں لگی ھوئی سلاخوں پر ھلکی چوٹ دیتے ھوئے ایک طرح سے جل ترنگ بجاتا ھوا چلا جا رھا تھا. میں نے کئی دن تک اسطرح دیکھا. پہلے تو یہ سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں کرتا ھے. لیکن بعد میں معلوم ھوا کہ یہ طریقہ ھر ایک سلاخ کو جانچنے کا ھے. اگر کہیں کوئی سلاخ کٹی یا ٹوٹی ھو تو اسکی آواز مختلف قسم کی ھوگی. قیدیوں کے پاس کوئی

رسی یا سوت کی بنی ہوئی تھیلی اور لمبا کپڑا بھی رھنے دینے کا قاعدہ نہیں ھے. پہننے کیلئے تو «جانگھیا» اور آدھی آستین کا کرتا، اور اوڑھنے کیلئے کمبل معمولی طرح سے ملتے ھیں. اس کے علاوہ ایک ڈیڑھ فٹ لمبا چوڑا رومال ملتا ھے. لمبا کپڑا اور رسی اسلئے نہیں دی جاتی کہ قیدی کہیں پھانسی نہ لگا لے. تھیلی بھی اسلئے نہیں دی جاتی کہ ایسا دیکھا گیا ھے کہ تھیلی سے گھس گھس کر اور لوھے کی سلاخ کاٹ کر قیدی بھاگ گیا ھے. جیل کے سارے احاطہ کے اندر کوئی چیز بھی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ ھٹائی جا سکے، رات کو باھر نہیں چھوڑی جاتی. کیونکہ اس کے سہارے سے دیوار پر چڑھکر قیدی بھاگ سکتا ھے. اس لئے کوئی رسی بھی باھر نہیں چھوڑتے. کپڑے سکھانے کیلئے بہت دنوں تک ھم لوگوں کو بھی رسی ملنے میں دقت ہوئی. بعد میں ملی بھی تو اس طرح سے کہ سپاھی اسے سویرے لاتا اور شام سے پہلے واپس لیجاتا.

جیل کے احاطہ کے اندر «پپیتا» یا کیلا جیسے ھلکے لمبے درخت بھی رھنے دینے کا حکم نہیں ھے. کیونکہ وہ آسانی سے توڑے یا کاٹے جا سکتے ھیں. اور ان کو بھی دیوار سے

لگا کر قیدی اسکے ذریعہ بھاگ سکتا ھے. اونچی دیوار کے نزدیك کوئی درخت اندر یا باھر نہیں رھنے دیا جاتا. جو درخت دیکھنے میں آتے ھیں وہ اتنی دوری پر ھوتے ھیں کہ ان تك کوئی چھلانگ مار کر بھی نہیں پھونچ سکتا. رات میں ھر ایك قیدی باری باری سے ھر کمرہ میں جاگتا رھتا ھے اور چلا چلا کر سپاھی کو بتاتا ھے کہ اس کمرے میں جتنے قیدی بند ھوئے تھے گنتی کے مطابق موجود ھیں. ھر «بیرك» میں ایك روشنی جلتی ھے. لیکن وہ اتنی اونچی رکھی جاتی ھے کہ وھاں تك کوئی پھونچ نہیں سکتا. جب رات کو سپاھی پھونچتا ھے تو گن لیتا ھے کہ جتنے قیدی بند ھوئے تھے وہ موجود ھیں یا نہیں. دن کو بھی کئی بار قیدیوں کی گنتی کی جاتی. شام کو جب سب «بیرك» بند ھو جاتی ھیں تو شمار کر کے دیکھ لیا جاتا ھے کہ کتنے نئے آئے اور کتنے چھوڑے؟ ان سب کا حساب ملا کر جیل خانے کے اندر جتنے موجود ھونے چاھئیں، اتنے موجود ھیں یا نہیں. اگر کہیں حساب میں غلطی ھو جاتی ھے تو افسروں کو بہت پریشانی ھوتی ھے، اور جب تك حساب ٹھیك نہیں مل جاتا وہ دن

بھر کا کام ختم نہیں سمجھتے. اسیطرح صبح بھی جب تک حساب ٹھیک نہیں مل جاتا پریشان رہتے ہیں اور قیدیوں کو باہر نہیں نکلنے دیتے. اتنی احتیاط کے باوجود بھی قیدی بھاگ ہی جاتے ہیں. کبھی دیوار کود کر اور کبھی لوہے کے سیخچے توڑ کر اور کبھی دوسرے طریقہ سے، اسمیں شک نہیں کہ سب ہی قاعدوں کی اگر ٹھیک پابندی کی جائے، تو قیدی کا نکل بھاگنا بہت مشکل ہے.

ان قاعدونکا استعمال قیدیوں کو بھاگنے سے روکنے کیلئے ہوتا ہے. لیکن کچھ قاعدے ایسے بھی ہیں جو ان کے دل پر یہ اثر کرتے رہتے ہیں کہ آخر وہ قیدی ہی تو ہیں، وہاں وہ تکلیف اٹھانے کیلئے ہی بھیجے گئے ہیں، اور دوسرے آدمیوں سے بالکل مختلف ہیں. غریب بھی ہیں، بے عزتی تو قدم قدم پر ان کو سہنی پڑتی ہے. جسم کی حفاظت کیلئے انتظام اچھا رہتا ہے. اگر انہیں کھانے کیلئے قانون کے مطابق جو کچھ مقرر ہے، وہ ٹھیک طرح سے دیا جائے، اس میں چوری نہ ہو تو وہ تندرستی کیلئے کافی ہے. جیل کے اندر بیماروں کے لئے بھی انتظام ٹھیک رہتا ہے، لیکن ملازم

کبھی اپنا فرض پورا نہیں کرتے. اس لئے کھانا اور دوا دونوں سے قیدی بالکل محروم رہتے ہیں، جتنا ان کو ملنا چاہئے، نہیں ملتا. مجھے سب چیزوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کہ سارے انتظام کی سیاست یہ ہے کہ قیدی کے دل میں ڈر پیدا کیا جائے، اسکی روح دبا دی جائے، ہمت توڑ دی جائے. تا کہ جب کبھی وہ باہر نکلے تو پست ہمت، مایوس اور دکھی آدمی ہو کر نکلے. قیدیوں سے کچھ کام بھی لیا جاتا ہے. پہلے کچھ کام ایسے بھی ہوتے تھے جو ان کے جسم اور دل دونوں کو توڑ ڈالتے تھے جیسے کولھو کا کام، لیکن بہار میں وہ اٹھا دیا گیا ہے. دوسرے جو کام ہیں وہ ایسے ہیں جنکو لوگ باہر بھی کیا کرتے ہیں، ان کے کرنے میں کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی. کچھ کام ایسے بھی کرائے جاتے ہیں، جنکو اگر قیدی سیکھ لے اور باہر آ کر کرنا چاہے تو اس کو ایک روزگار مل جائے، اور وہ اپنے کو مالی مشکلات سے آزاد بنا لے. لیکن میں نہیں جانتا کہ اس سے کتنے قیدی فائدہ اٹھاتے ہیں. ہاں، میں نے ایک ایسے قیدی کو دیکھا ہے جو کئی بار جیل جا کر دری اور

قالین بننے کے کام میں اتنا ماہر ہو گیا کہ وہ اچھی سی چیزیں تیار کر سکتا. آخر میں رہا ہونیکے بعد جیل میں دوسرے قیدیوں کو یہ کام سکھانے کیلئے نوکر رکھ لیا گیا. اور وہ کئی سال سے یہ کام کر رہا ھے. اب وہ آرام سے ھے اور بھلا مانس بن گیا ھے. اسیطرح سے ایك دوسرے قیدی کو بھی میں نے دیکھا. وہ بڑا نامی ڈکیٹ تھا. ایك زمانہ تك پولیس اسکو پکڑنے سے عاجز رھی. عمر قید کی سزا پاکر جیل گیا. وہ بہت ھوشیار تھا. کپڑا بننے وغیرہ کا کام خوب اچھی طرح جان گیا تھا، اور اسکی زندگی بھی سدھر گئی تھی اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جیل سے باھر نکلنے پر میں اسکو کھادی کے کام میں نوکر رکھا دوں. میں نے وعدہ بھی کیا. لیکن جیل سے رہا ھو کر وہ میرے پاس نہیں آیا. وہ ایك کوڑھ آشرم میں خدمت کا کام کر رہا ھے. اتفاق سے جب میں کوڑھ آشرم گیا اور اس سے ملاقات ھوئی، تو معلوم ھوا کہ وہ وھاں کے کام سے مطمئن ھے اور آشرم کے لوگ بھی اس سے مطمئن ھیں. اسطرح سدھرے اور سلجھے ھوئے قیدی بہت کم نکلتے ھیں.

ایك جو بچپن میں گرہ کٹ بن گیا، جتنی بار جیل گیا، اس سے زیادہ ماہر گرہ کٹ بنکر نکلا. میں نے دیکھا کہ ایکبار بیل گاڑیوں پر جیل میں چاول لایا گیا. وہ گاڑی والے باہر کے دیہاتی آدمی تھے اس لئے وہ بیچارے سیدھے سادے اور بیخوف تھے. جیل کے قیدیوں نے چاول کے بورے ان کی گاڑیوں سے اتارے. نمعلوم کب اور کیسے، بورے کے ساتھ ھی، ایك گاڑی‌بان کی جیب میں کچھ رقم تھی، نکال لی. اس بیچارے کو اسکا پتہ چلنے کے وقت لگا. اسکا پتہ تو جیل کے افسر بھی نہ لگا سکے کہ یہ رقم کس نے نکالی. جب بہت سے چور، گرہ کٹ، اور ڈکیٹ اکٹھے ھوتے ھیں تو ایك دوسرے سے باتیں کرتے ھیں، اور ایك دوسرے کے تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ھیں، اسکے ساتھ ھی نت نئے ڈھنگ بھی سیکھتے رہتے ھیں. جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے کہا کہ «جیل کے افسر بھی ایسے لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے ویسے ھی ھو جاتے ھیں. ان میں تھوڑے ھی ایسے ھوتے ھیں جو اپنے کو اس اثر سے بچا سکیں». بات یہ سہی ھے، وہ اگر اچھے ھوں تو قیدیوں کو سدھار بھی سکتے ھیں. لیکن جیل

کے سارے قاعدے ایسے بنائے گئے ہیں کہ ان میں سدھار کی گنجائش نہ کے برابر ہے. ان میں ہر طرح سے ڈر پیدا کر کے دل توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے. اس طرح اگر کوئی سدھر جاتا ہے تو اپنی خوشی سے ہی سدھرتا ہے، جیل کے قاعدوں کی وجہ سے نہیں.

جیل میں زیادہ ایسے ہی لوگ جاتے ہیں جو موٹے تازے ہوتے ہیں، اور جو قید ہونے سے پہلے کام کر کے کچھ پیدا کرتے رہتے ہیں. ان سے اگر ٹھیک طرح سے کام لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کم سے کم اتنا نہ کما لیں جو ان کے کھانے پینے کیلئے کافی ہو. معمولی طور سے ایک جوان آدمی جیل کے باہر اتنا پیدا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو کھلا سکتا ہے. وہ جیل میں جا کر گورنمنٹ پر بوجھ ہو جاتا ہے. صرف اس کی نگرانی کے لئے ہی خرچ نہیں کرنا پڑتا، بلکہ اس کو جو کھانا کپڑا دیا جاتا ہے وہ بھی گورنمنٹ ہی کو دینا پڑتا ہے. یعنی جو سماج سے ٹیکس وصول کر کے دیا جاتا ہے، یہ سماج کیلئے تگنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے. ایک تو اس نے سماج کے خلاف کچھ کام کیا، جس کی پاداش

میں اس کو سزا ملی. دوسرے وہ جو کچھ پیدا کرسکتا تھا اور دوسروں کو اور اپنے کو پال سکتا تھا، وہ بند ہوگیا. تیسرے اس کے کھانے کپڑے کیلئے سماج کو خرچ کرنا پڑا. اگر جیل کی سیاست سدھر جائے تو یہ سب نقصان موقوف ہوسکتا ھے. جیل کے خرچ کا بہت بڑا حصہ قیدیوں سے ان کے لائق کام لیکر وصول کیا جاسکتا ھے. اسکے لئے جیل کے مقصد کو بدلنا ضروری ھے. اگر جیل ڈرانے اور سزا دینے کے بجائے سدھار اور اصلاح کی جگہ بن جائے، جہاں بگڑے ہوئے لوگ جاکر اچھے ھوسکیں، تو اس سے بڑھکر سماج کی کوئی دوسری بھلائی نہیں ھوسکتی. پھر اگر کوئی چلا بھی جائے تو بہتر ھوکر وھاں سے نکلے، اور باہر بھی سماج کا بہترین آدمی ھوکر رھے. گویا وہ جیل کے اندر بھی کام کرکے اتنا پیدا کرلے کہ جیل کا محکمہ خرچ کا محکمہ نہ بن کر آمدنی کا محکمہ بن جائے. اس کام کیلئے ایسے افسر ھونے چاھئیں جو اس سیاست کو اچھی طرح سمجھیں اور قیدیوں کے ساتھ صرف سختی ھی کا نہیں بلکہ ھمدردی کا بھی برتاؤ کریں. ان کو صرف ڈرائیں ھی نہیں بلکہ ان کی روح کو بھی بیدار کریں اور

ان کے رهن سهن کو سدهاریں.

یه ایك ایسا مسئله هے جس پر بهت کچھ کہا جاسکتا هے. اسکے متعلق بہت لٹریچر بهی تیار هوگیا هے. کئی ملکوں میں سدهار کی پالیسی سے کام بهی لیا جا رها هے. هم لوگ بهی اگر اپنے تجربه سے کام لیں اور جیل کا سدهار کرنا چاهیں تو بهت کچھ کرسکتے هیں. لیکن جهانتك مجھے معلوم هے، ابتك جو کچھ تهوڑی بهت سدهار کی تدبیریں کی گئیں وه زیاده تر سیاسی قیدیوں کو زیاده آسانیاں دینے کے لئے هی کی گئی هیں. لیکن سچ پوچھئے تو زیاده دهیان دینے کے قابل معمولی قیدی هی هیں. کیونکه سیاسی قیدی تو کچھ سمجهدار اور دبنگ هوتے هیں اور اپنا کام کئی طرح سے کبهی دبا کر کبهی ترکیب سے کبهی اپنے اچھے اثر سے نکال لیتے هیں. لیکن غریب معمولی قیدی جو بهت تجربه کار اور بدمعاش نہیں هوتے وه بیچارے جوں کے توں ره جاتے هیں.

میرا خیال هے که جیل کی اصلاح میں تین چار باتوں کا غور کرنا ضروری هے. جهاں تك هو سکے اسکے قاعدے اس اصول سے بدلے جائیں که جو لوگ یکایك کسی غلطی سے

جیل چلے گئے ہوں ان کا ایسے قیدیوں سے میل جول نہ ہوسکے جو سچ مچ چھٹے ہوئے بدمعاش ہوں. اکثر گاؤں کے لوگ آپس میں لڑتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو سزا ہو جاتی ہے. لیکن وہ دل کے برے نہیں ہوتے، صرف غصے میں آکر اور کسی پیدا ہونے والی وجہ سے کوئی غلطی کر دیتے ہیں. ایسوں کو بدمعاش قیدیوں کی صحبت سے الگ رکھنا چاہئے. جو قیدی کم عمر ہوتے ہیں وہ آج بھی الگ رکھے جاتے ہیں، لیکن ان کے بھی سدھارنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہوتا ہے، اس لئے وہ انتظام ہونا چاہئے. ان میں بھی یہ دیکھنا چاہئے کہ ان میں سے کون بار بار جیل گیا ہے اور کون دفعتاً کسی غلطی کی وجہ سے سزا پا گیا ہے. ان دونوں قسم کے نوجوانوں کو بھی الگ الگ رکھنا چاہئے. یہ قاعدہ آج بھی ہے لیکن اس کا صحیح استعمال نہیں ہوتا ہے. ایسے نوجوانوں کو پرانے بدمعاش قیدیوں کے ساتھ کبھی نہ رکھنا چاہئے. میں نے دیکھا کہ جیل کے اندر یہ سدھرنے کے بجائے اور زیادہ چوری اور گرہ کٹی وغیرہ کی بری عادتوں میں گرفتار ہوجاتے ہیں. تعلیم، اچھے لوگوں

کی صحبت میں دل کو بہلائے رکھنا اور کسی طرح کا لالچ نہ ہونا، یہ سب سدھار کی تدبیریں ہیں. انسانی نفسیات کے جاننے والے یہ بتا سکتے ہیں کہ کن کن طریقوں سے وہ نوجوان سدھارے جا سکتے ہیں. اسوقت جو تدبیریں کی جاتی ہیں وہ نفی کے برابر ہیں. قصور کے اعتبار سے بروں کی بھی کئی قسمیں کی جا سکتی ہیں. لیکن یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب جیل کے افسر خود اس پالیسی کو سمجھ لیں اور اسکے متعلق کچھ علم حاصل کرلیں.

فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو بہت دنوں تک خاص تعلیم دی جاتی ہے. پولیس کے سپاہیوں اور افسروں کی تعلیم کا بھی انتظام ہے. منصف اور مجسٹریٹ بھی اگرچہ کالج کے پڑھے ہوئے ہوتے ہیں مگر پھر بھی کچھ دنوں کے لئے ان کو اپنے خاص قانونی کام کے لئے خاص تعلیم لینی پڑتی ہے. لیکن جہاں تک مجھے علم ہے جیل کے افسروں کے لئے کسی قسم کی خاص تعلیم کا انتظام نہیں ہے. وہ تقرر کے بعد جیل میں رکھ دئے جاتے ہیں، جو کام وہاں ہوتا رہتا ہے اسی کو دیکھ کر جو کچھ سیکھ سکتے ہیں سیکھ لیتے ہیں

اس کے معنے یہ هیں کہ پرانے هی طریقہ کو سیکھتے اور کام میں لاتے هیں. اس کا ایك ثبوت یہ ھے کہ جو جیل کے سب سے بڑے افسر هوتے هیں وہ فوج، پولیس یا ڈاکٹروں میں سے یا کسی دوسرے محکمہ سے لئے جاتے هیں. ان کو جیل کے متعلق کوئی خاص علم نہیں هوتا، البتہ انتظامی کام ٹھیك جانتے هیں. جیلر وغیرہ تو نیچے هی سے ترقی پاتے هوئے مقرر هوتے هیں. اس طرح یہ سارا محکمہ ایسے لوگوں کے هاتھوں میں هوتا ھے جو نفسیات کا کوئی علم نہیں رکھتے آج تمام دنیا کے ملکوں میں جیل کے متعلق جو اصلاحیں هو رهی هیں ان سے بھی واقفیت نہیں رکھتے اور جن کے سامنے سدھار کے لئے کوئی نمونہ بھی نہیں هوتا. وہ صرف ایك هی بات جانتے هیں، یعنی کس طرح قیدی سے جیل کے قانون کی پابندی کرائی جائے. اور کوئی قیدی کسی طرح سے بھی بھاگنے نہ پائے. قیدی کے سدھارنے کا تو ان کے سامنے کوئی سوال هی نہیں هوتا. جو قاعدے قیدیوں کے کھانے پینے کے لئے بنائے گئے وہ ایسے هیں، جن کے متعلق میرے ایك دوست کہا کرتے تھے کہ قیدی کو اتنا کھانا

مل جاتا ہے کہ وہ نہ مرے اور نہ موٹا ہو. اور جیل کے افسروں کی تو یہی کوشش رہتی ہے کہ جیل سے جو نکلے وہ خوف زدہ ہوکر نکلے، سدھر کر نہ نکلے. لیکن اسکا نتیجہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ جو بھلا آدمی اتفاق سے جیل چلا جاتا ہے، جس کو زیادہ ڈرانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، کیونکہ وہ دوبارہ قصور کرنے والا نہیں ہے، وہ ضرور خوف زدہ ہوکر نکلتا ہے. لیکن جو پکا بدمعاش ہوتا ہے وہ باہر صرف اس لئے جاتا ہے کہ دل بہلا آئے. جیل میں جو سیکھتا ہے وہ اسکو باہر جانے پر استعمال میں لا کر پھر جیل چلا جاتا ہے، کیونکہ جیل میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی. قیدیوں سے جیل میں پیداوار کے لئے کام لینا چاهئے، نہ کہ سزا دینے کے لئے. اگر اس خیال سے کام لیا جائے اور کام میں لطف پیدا کرایا جائے، اور صرف سزا کے خوف سے ھی کام نہ کرایا جائے، تو انکی عادت بدل سکتی ہے اور جیل کی آمدنی بھی بڑھائی جاسکتی ہے. یہی ایک طریقہ ہے جس سے جیل خانے خود مکتفی بنائے جا سکتے ہیں، اور کوئی وجہ نہیں کہ سارا ڈپارٹمنٹ خود مکتفی نہ ہو جائے.

اس کے علاوہ کچھ مذھبی اور سیاسی تعلیم کا بھی انتظام ھونا چاھئے. آجکل بھی محض نام کے لئے کچھ انتظام ھے. اس سے کچھ نتیجہ نہیں نکلتا. جیل سے رھا ھونے کے بعد بہت سے نو آموز چور وغیرہ کچھ اس طرح پولیس کے چکر میں پڑ جاتے ھیں کہ ان کو خواہ مخواہ چوری ھی کرنی پڑتی ھے، کبھی کبھی پولیس ان کو اتنی تکلیف دیتی ھے کہ وہ پھر جیل ھی میں جانا آرام‌دہ سمجھتے ھیں. اس لئے جیل سے نکلے ھوئے لوگوں کی دیکھ بھال کیلئے بھی کوئی انتظام ھونا چاھئے. پولیس کے ذریعہ جو انتظام ھوتا ھے وہ تو جیل کے ھی زندگی کو باھر بھی معمولی ترمیم کے ساتھ قائم رکھنے کیلئے ھوتا ھے. قیدی کو کبھی آزاد ھوکر بے خوفی سے سدھری ھوئی زندگی گزارنے کا موقع ھی نہیں ملتا. اس لئے یہ کام پولیس کے ذریعہ نہیں ھوسکتا. اس کے لئے غیر سرکاری ادارہ ھونا چاھئے جو چھوٹے موٹے قیدیوں کی اس طرح مدد کرے کہ وہ معمولی سماجی زندگی میں گھل مل جائیں. جب جیل کے اندر سدھار ھوجائے اور باھر ان کو موافق فضا مل جائے، تو وہ قیدی نہ رہ کر سماج کے ایک تجربہ کار اور ھوشیار ممبر بن سکتے

هیں. اگر سزا اسی مقصد سے دی جائے تو جس کو سزا ملے وہ آرام میں رہے اور سماج بھی. سماج کا اتنا ھی فرض ھے، کیونکہ کوئی آدمی بغیر سبب کے برا نہیں بن سکتا. سماج میں ھی کچھ ایسی خرابی ھوتی ھے جس کی صحبت میں بیٹھکر یا تو برے کاموں کی همت افزائی ھوتی ھے یا ان کے کرنے کی ضرورت محسوس ھوتی ھے.

تیئیسواں باب

برٹش گورنمنٹ کی دو عملی سیاست کام کر رہی تھی. ایک طرف ستیہ گرہ کے دبانےکی تدبیر کی جا رہی تھی، دوسری طرف گول میز کانفرنس کا منصوبہ کر کے یہ دکھایا جا رہا تھا کہ وہ ہندوستان کو سیاسی اقتدار دینے کیلئے تیاری کر رہی ہے. جس وقت ہم لوگ جیل میں تھے اسیوقت ایک تدبیر ہوئی تھی کہ کانگریس کے لوگ بھی اس کانفرنس میں شریک ہوں. اس گفتگو کی ابتدا پنڈت موتی لال جی کیساتھ ایک انگریز اخبار نویس «سلوکومبھ» نامی کے ذریعہ سے ہوئی. پنڈت موتی لال جی اور پنڈت جواہر لال وغیرہ مہاتماجی کیساتھ مشورہ کرنے کیلئے نینی جیل (پریاگ) سے یرودا (پونا) جیل میں لیجائے گئے. جب تک یہ گفتگو ہوتی رہی سبھی جیلونمیں جہاں ستیہ گرہی تھے، طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں. کچھ لوگ تو اس گفتگو کو بڑی امید سے دیکھ رہے تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس کے ذریعہ کوئی سمجھوتہ ہو ہی جائیگا، اور جیل جانے کا سلسلہ بند ہو

جائیگا. دوسرے لوگ سمجھتے تھے کہ ہم لوگوں کی قربانی
اتنی نہیں ہوئی ہے کہ اس کا اثر برٹش گورنمنٹ پر اتنا بڑا ہو
کہ وہ سچ مچ ہمیں سوراج دینے کیلئے تیار ہو گئی ہو.
کچھ لوگ اسی بات کو دوسری طرح سے سوچا کرتے تھے،
کہ ہم نے ابتك اتنا نہیں کیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہم سے
دب جائے، اور مجبور ہوکر ہماری بات مان لے. باہر کے
جو لوگ اسمیں دلچسپی لے رہے تھے، جنمیں ممتاز، سرتیج
بہادر سپرو، ڈاکٹر جیکر بڑے لوگونمیں سے تھے، وہ دل
سے چاھتے تھے کہ کوئی سمجھوتہ ہوکر جھگڑا ختم ہو جائے.
لیکن گفتگو کا کچھ نتیجہ نہ نکلا. گورنمنٹ چاھتی تھی کہ
کانگریس کے لوگ کانفرنس میں شریك ہوں. کیونکہ وہ جانتی
تھی کہ اگر کانگریس کیساتھ کچھ طے نہ ہوا تو گول میز کانفرنس
بغیر دولھا کی برات ہوکر رہ جائیگی. لیکن وہ کانگریس کی
مانگ پورا کرنے کیلئے تیار نہیں تھی. اسکو تو یہ بھی
دکھلانا تھا کہ کانگریس کو چھوڑ کر بھی وہ اپنا کام چلا لیگی،
جیسا اس نے سنہ ۱۹۲۱ ع میں کیا تھا.

گول میز کانفرنس ہوئی. اسمیں سوائے کانگریس کے

دوسرے سب لوگ شریك ہوئے، جسمیں دیسی والیان ملك بھی تھے. اس کا ایك اچھا نتیجه یه ہوا که راجاؤں نے بھی اپنی طرف سے کہدیا که اگر سارے ہندوستان کی ایك یونین بنے تو وہ بھی اسی میں شریك ہو جائینگے. اس سے آجتك جو ہندوستان دو حصونمیں تقسیم تھا، یعنی برٹش سرکار کے تحت اور ریاستوں کے تحت، اسکے ایك ہو جانیکا راسته کھل گیا. لیکن شاید برٹش گورنمنٹ نے یه سمجھ لیا تھا که برطانوی ہند کو وہ بہت دنوں تك اختیارات سے محروم نہیں رکھ سکے گی، البته راجواڑوں کو ساتھ ملا کر جہاں رعایا کا ابھی تك کوئی نام نہیں تھا، وہ راجواڑوں کی معرفت خفیه طور سے اپنے ہاتھونمیں اختیار رکھ سکیگی. شاید اسی لئے اس نے اس چیز کو پسند کیا. کانگریس کی غیر حاضری میں قطعی فیصله نہیں ہو سکتا تھا. کانفرنس اس امید کیساتھ اس سال ملتوی کی گئی. اور یه سوچکر که وہ لوگ جب پھر ملیں گے، تو اس وقت کانگریس بھی اسمیں شریك ہوگی اور پھر کوئی متفقه فیصله ہو سکے گا. ادھر اس بات کی کوشش کی گئی که کانگریس کے لوگ کسی طرح سے بھی گول میز کانفرنس میں

پہونچائے جائیں. اسکے لئے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ جو کانگریسی لیڈر جیل میں تھے وہ چھوڑ دیئے گئے، تا کہ وہ آپس میں مل کر اس مسئلہ پر غور کریں. گورنمنٹ جانتی تھی کہ جب تک ان کو بلا شرط چھوڑ کر پوری آزادی کیساتھ غور کرنے کا موقع نہیں دیا جائیگا اس وقت تک وہ کچھ نہیں کرینگے. اسلئے ورکنگ کمیٹی کے سبھی ممبروں کو جو اس زمانہ میں کچھ دنوں کیلئے عارضی طور پر ممبر بنا دیئے گئے تھے چھوڑ دیئے گئے. الہ‌آباد میں گفتگو ہوئی. سر تیج بہادر سپرو وغیرہ گول میز کانفرنس سے ہندوستان واپس آچکے تھے. انہوں نے وہاں کی سب باتیں بتا کر اپنی رائے دی. آخر میں یہ ارادہ ہوا کہ اگر موقع مل جائے تو مہاتماجی لارڈ اروِن وائسرائے سے گفتگو کریں. ٹھیک اسی وقت جب یہ گفتگو جاری تھی، ملک کی بد قسمتی سے پنڈت موتی لال جی کا انتقال ہو گیا. سارے ملک میں ماتم ہونے لگا. لیکن کام تو کرنا ھی تھا اسلئے گفتگو جاری رکھنے کا ارادہ قائم رہا.

ان دنوں دو قسم کے خیالات پھیلے ہوئے تھے. کچھ لوگ تو چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح صلح ہو جائے،

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو صلح تو چاھتے تھے مگر اسی حالت میں کہ برٹش گورنمنٹ ھماری باتوں کو مان کر کم سے کم آگے کیلئے راستہ صاف کردے. مہاتماجی لارڈ اروِن سے دلی میں گفتگو کرنے لگے. ورکنگ کمیٹی کے لوگ ان کے ساتھ ھی ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ٹھہرے تھے. مہاتماجی جو کچھ باتیں وھاں کر کے آتے، سب کو سنا دیتے. ان کا سب سے زیادہ زور نمک کے قانون پر تھا جو ستیہ گرہ کا سب سے بڑا ھتھیار تھا. سردار ولبھ بھائی کا زور اس بات پر تھا کہ جو زمینیں کسانوں کی ضبط ھوئی ھیں واپس کردی جائیں، اور جو ستیہ گرھی قیدی جیل میں تھے ان کو تو چھوڑنا تھا ھی، لیکن جو آشرم وغیرہ ضبط کئے گئے تھے ان کو بھی واپس کرنا تھا. گفتگو کئی دن تک جاری رھی. آخر میں سمجھوتے کا ایک مسودہ تیار ھوا. لندن سے منظوری لینے کیلئے گفتگو کی خبر دی جایا کرتی تھی، اس عرصہ کیلئے یہاں گفتگو روک دی جایا کرتی تھی. ٹہلنے کے وقت مہاتماجی کیساتھ میں اکثر سویرے باھر جایا کرتا تھا، اس وقت زیادہ باتیں ھوا کرتی تھیں. میری خواھش تو تھی

که صلح هو جائے، لیکن ساتھ ھی میں یہ بھی چاھتا تھا کہ اس کیلئے شرطیں ایسی ھوں کہ جس سے ھمارے لوگوں کا حوصلہ بلند رھے. چنانچہ میں نے کہا بھی کہ جو کچھ بھی ھو، ایسی شرط ضرور رکھی جائے جس سے ھماری جیت کا اشارہ ھو. مہاتماجی نے کہا کہ جہانتك ھم نے سچ مچ جیتا ھے اتنا ھی صلحنامہ میں آ سکتا ھے، اس سے زیادہ نہیں. جہانتك ھم نے سچ مچ جیتا ھے اگر اس سے زیادہ صلح نامہ میں آ بھی جائے تو وہ کسی کام کا نہ ھوگا. کیونکہ ھمکو اتنا ھی نفع سمجھوتے سے مل سکتا ھے جتنا نفع اٹھانے کی ھم میں طاقت ھے. اور وہ طاقت اسی مقدار میں ھم میں آئی ھے جس مقدار میں ھم جیت سکے. اسلئے یہ غلط خیال چھوڑ دینا چاھئے کہ اپنی طاقت سے زیادہ ھم سمجھوتے سے پا سکیں گے. میں نے سوچا کہ مہاتماجی کا اعتقاد سچائی پر اتنا ھے کہ وہ طاقت سے زیادہ سمجھوتے کے ذریعہ سے لینے میں کچھ غلطی دیکھتے ھیں. اسی وجہ سے نہ تو اسکی امید رکھتے ھیں اور نہ اس کیلئے تدبیر کرتے ھیں. بات ٹھیك ھی تھی، جو کچھ ھم ھضم نہیں کر سکتے اسکو لے لینے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ھو سکتا،

بلکه اس سے نقصان ھی ھے.

مہاتماجی کا لارڈ ارون پر اعتماد تھا. وہ سمجھتے تھے کہ وائسرائے جتنا کہتے ھیں اتنا پورا کرینگے. لارڈ ارون کا بھی مہاتماجی پر اعتماد تھا. وہ بھی چاھتے تھے کہ کوئی راستہ ایسا نکل آئے جس سے گول میز کانفرنس میں کانگریس شریک ہو جائے. اسکے لئے وہ بھی جہاں تک جا سکتے تھے، وھاں تک جانیکے لئے تیار تھے. اور وھاں تک وہ گئے بھی لیکن انکے ماتحت افسر سمجھوتے کی گفتگو ھی کو ناپسند کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ انہوں نے تحریک کو دبا دیا ھے، اب سمجھوتے کی کوئی ضرورت نہیں. لیکن چونکہ برٹش گورنمنٹ گول میز کانفرنس میں مہاتماجی کو شریک کرنے پر تلی ہوئی تھی. اسلئے وہ چاھتی تھی کہ ان سے کچھ باتیں کرکے انکو وھاں بھیج دینا چاھئے، پھر اسکے بعد دیکھا جائیگا. اتفاق سے لارڈ ارون کے عہدے کی میعاد بھی اسی وقت ختم ہو گئی، اور سمجھوتہ کرکے وہ چلے گئے. ان کی جگہ پر لارڈ ولنگڈن آگئے، جو بالکل اپنے ماتحت افسروں کے ھاتھ میں تھے یا ان سے متفق تھے. نتیجہ یہ ھوا کہ سمجھوتہ پر دستخط تو

ہو گئے، لیکن لارڈ ارون کے جاتے ہی اسے کسی نہ کسی طرح سے بیکار بنانے کی تدبیریں شروع ہو گئیں. لارڈ ارون کے زمانہ میں اسکی جو شرطیں پوری کی جا چکی تھیں وہ تو باقی رہیں لیکن دوسری شرطوں کی تکمیل میں دقت پیش آنے لگی. کئی ماہ تک مہاتماجی کو شرطوں کے پورا کرانے میں پریشان رہنا پڑا. ہمکو تو صرف ایک ہی شرط پوری کرنی تھی کہ ستیہ گرہ بند کردی جائے. یہ شرط سمجھوتہ ہوتے ہی پوری کردی گئی، اور مہاتماجی اور ورکنگ کمیٹی کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ ستیہ گرہ بند کردی جائے. اس اعلان کے ہوتے ہی وہ سبھی جگہوں پر بند ہوگئی. لیکن گورنمنٹ کو قیدیوں کا چھوڑنا، ضبط شدہ آشرم کمیٹیوں کو واپس دینا، نمک کے قانون کے رہتے ہوئے آسانیاں دینے کی جو شرائط طے ہوئی تھیں انکو پورا کرنا، گجرات میں ضبط شدہ زمینوں کے متعلق جانچ کرنا، وغیرہ وغیرہ بہت سی باتیں ہوئی تھیں، انمیں سے ہر ایک میں رکاوٹیں ڈالی گئیں. جو بات سب سے آسان تھی، یعنی قیدیوں کا چھوڑنا، اس کیلئے بھی مہینوں خط و کتابت کرنی پڑی. بہپور (بھاگلپور) کا ضبط شدہ آشرم تو آخر تک

نہیں چھوڑا گیا. جب کوئی دوسرا بہانہ نہیں ملا، تو گورنمنٹ کی طرف سے کچھ ایسی تدبیر کی گئی، کہ اس زمین پر بعض لوگوں سے دعوے کرا کر ان سے کچھ لکھوا لیا گیا، اور اسی کے بھروسہ پر اس پر قبضہ رکھا گیا. بات یہ تھی کہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے کہ صوبہ کے افسر شرطوں کو ماننا ھی نہیں چاھتے تھے. اس لئے جہاں تك رکاوٹ ڈال سکے وہ اسکو ڈالتے ھی گئے.

سمجھوتے کے وقت ھی ایك واقعہ پیش ھوا جس نے ملك میں بڑی ھلچل پیدا کردی. سردار بھگت سنگھ کے مقدمہ میں، جو بہت دن سے چل رھا تھا، حکم سنا دیا گیا اور پھانسی کی سزا ھو گئی. ان پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے ایك انگریز افسر کو مار ڈالا تھا، جس نے «سائمن کمیشن» کے آنے کے وقت لاجپت رائے پر وار کیا تھا. جسکی وجہ سے کچھ دنوں بعد ان کا انتقال ھو گیا. مہاتماجی نے لارڈ ارون سے کہا کہ وہ پھانسی کی سزا معاف کردیں اور اسکے بجائے جنم قید کی سزا دے دیں. لیکن وائسرائے اس پر راضی نہ ھوئے. ادھر کانگریس کا باضابطہ اجلاس جو ستیہ گرہ کے زمانہ میں

نہیں ہوا تھا، کراچی میں کرنے کا ارادہ کیا گیا. اس کا وقت
بھی نزدیك آ گیا تھا. سمجھوتہ کو کانگریس میں منظور کرانا
تھا. کیونکہ اسکی ایك شرط یہ تھی کہ کانگریس کا نمایندہ
گول میز کانفرنس میں شریك ہو. مہاتماجی کا خیال تھا کہ
سردار بھگت سنگھ کی پھانسی اگر رك گئی تو ملك میں اچھی
فضا قائم ہو جائیگی. اس وقت صرف سمجھوتے کے پاس
کرانے ہی میں آسانی نہیں ہوگی بلکہ دوسری طرح سے جو
جھگڑا چل رہا تھا وہ کم ہو جائیگا، اور اس سے سچا سمجھوتہ
جیسا ہونا چاہئے ویسا ہو سکے گا. لیکن لارڈ ارون پھانسی کو
نہ روك سکے، شاید ان پر دوسرے افسروں کا اتنا زور پڑا کہ
وہ ایسا نہ کر سکے. انہوں نے آخر میں یہ کہا کہ اگر آپ
چاہیں تو میں پھانسی کی تاریخ کو کانگریس کے بعد تك کیلئے
ملتوی کر سکتا ہوں، لیکن پھانسی کی سزا معاف نہیں کرسکتا.
مہاتماجی نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو میں نہیں چاہتا کہ کانگریس
کے اجلاس تك پھانسی کو ٹال دیا جائے، اور جب کانگریس
سمجھوتہ کو منظور کر لے تو بعد میں پھانسی دے دی جائے.
اس سے بہتر یہی ہے کہ کانگریس سے قبل پھانسی ہو جائے

تاکہ کانگریس کسی دھوکے میں نہ رہے ، اور ساری حالت سمجھ کر جو مناسب سمجھے کرے. چنانچہ ایسا ھی ھوا. کانگریس سے دو تین روز قبل خاموشی کیساتھ پھانسی دے دی گئی. سب کچھ ھو جانے کے بعد یہ بات ظاھر کی گئی. اس سے لوگوں میں ، خاصکر پنجابیوں میں غیظ و غضب پیدا ھو گیا.

سمجھوتہ کی کچھ شرطوں نے پنڈت جواھر لال نہرو کو تکلیف دی. مہاتماجی کو انہیں بہت سمجھانا پڑا. لیکن وہ ایسے لوگوں میں سے نہیں تھے کہ ایک بات طے ھو جانیکے بعد اس کی مخالفت کرتے رھتے. اگرچہ وہ غیر مطمئن تھے پھر بھی وہ خاموش ھو گئے. لیکن کچھ دوسرے لوگ پھانسی سے طیش میں آکر یا سمجھوتے ھی سے غیر مطمئن ھو کر اسکی مخالفت کرنے لگے. کراچی کانگریس کے وقت فضا بہت خراب ھو گئی تھی. جب ھم لوگ ریل سے کراچی جا رھے تھے، اس وقت راستہ میں بہت سے مخالف مظاھرے ھوئے. مہاتماجی کو لوگوں نے کالے پھول دئے. دوسرے طریق سے بھی یہ بتایا کہ سمجھوتے کی تمام باتوں سے لوگ غیر مطمئن

هیں. اس وقت مہاتماجی کا ضبط وتحمل اور اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم رہنے کی حالت دیکھنے کے قابل تھی. مظاہرے کرنیوالوں کے غصہ کو اپنے میٹھے لفظوں سے اور اپنے اوپر سارا گناہ لیکر ختم کرتے رہے. کانگریس میں مخالفت کا طوفان سا آتا ہوا معلوم ہوا. لیکن انہوں نے اسکو اس خوبی سے سنبھالا که اور کسی کیلئے اس طرح سے سنبھالنا ممکن نہیں تھا. ان کے جذبہ محبت سے مخالف بھی پگھل جاتے. جو لوگ بہت غصہ میں آتے وہ بھی مطمئن ہو کر چلے جاتے.

کراچی کانگریس کے بعد یہ طے ہو گیا که کانگریس کے نمایندے گول میز کانفرنس میں جائینگے، اور صرف مہاتماجی وھاں کانگریس کی نمایندگی کرینگے. لیکن یه اسی وقت ہو سکتا تھا جبکه سمجھوته کی شرطیں پوری ہو جائیں. اسمیں کافی رکاوٹ پیدا ہوئی. مہاتماجی برابر خط و کتابت کرکے شرطوں کو پورا کرانے میں لگے رہے. اسمیں بھی ان کا تحمل اور استقلال خوب دیکھنے میں آئے. وہ اپنی باتیں چھوڑتے نہیں تھے کیونکه وہ جانتے تھے که کوئی بھی افسر سمجھوته کی شرطوں کو علانیه طور پر صاف صاف ماننے کی بات کبھی نه کہے گا.

ان شرطوں کو انہیں پورا تو کرنا ھی ھوگا. لیکن وہ رکاوٹیں ڈال کر ھمکو اتنا تھکا سکتے ھیں کہ ھم خود مایوس ھو کر کہہ دیں کہ اب شرطیں پوری ھو گئیں، پوری ہونیکی ضرورت نہیں رھی. مہاتماجی اسکے لئے تیار نہیں تھے، وہ ایك ایك کرکے سبھی شرطوں کو پورا کراتے رھے. آخر میں گول میز کانفرنس میں جانے کا وقت آگیا. اسوقت تك گجرات کی زمینوں کے متعلق جانچ پوری نہیں ھوئی تھی. مہاتماجی بھی اس پر کہ یہ معاملہ اگر طے نہ ھوگا تو ھم گول میز کانفرنس میں شریك نہ ھو سکیں گے. «لارڈ ولنگڈن» نے اپنی ھار مان کر انکی بات منظور کرلی. کیونکہ گول میز کانفرنس میں پہونچنے کیلئے بمبئی سے جہاز تك معمولی طور سے مہاتماجی نہیں پہوچ سکتے تھے اسلئے اسپیشل سے وہ پہونچائے گئے، اور مقررہ وقت سے کچھ بعد تك جہاز روك دیا گیا.

مہاتماجی کی بات لارڈ ولنگڈن نے مجبور ھو کر مان لی تھی. لیکن وہ اسی وقت سے اس فکر میں تھے، کہ کسی نہ کسی طرح مہاتماجی اور کانگریس کو دبانا چاھئے. ادھر مہاتماجی انگلستان گئے، ادھر چالیں چلی جانے لگیں. کہ

کانگریس کو کسی نہ کسی تدبیر سے قصوروار ٹھرا کر سختی کیساتھ دبا دیا جائے تاکہ وہ پھر سر نہ اٹھا سکے. سردار ولبھ بھائی پٹیل جو کراچی کانگریس کے صدر ہوئے تھے مہاتماجی کی غیر موجودگی میں شرطوں کو پورا کرانے اور یہاں کی کی حالت سنبھالنے میں بہت ھی مضبوطی اور هوشیاری سے لگے رہے. مگر جب ایك طرف سے بگاڑ ھی پر گورنمنٹ کے افسر تلے ہوئے تھے، تو ان کی کیا اور کھانتك چل سکتی تھی. ادھر گول میز کانفرنس میں بھی ایسی حالت پیدا ہو گئی تھی. کہ وھاں بھی مہاتماجی جیسا چاھتے تھے ویسا نہ کر پائے. وھاں پر دنیا کے سامنے یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی کہ برٹش گورنمنٹ تو بہت کچھ کرنے پر تیار ھے، مگر هندوستان کے لوگ اتفاق کر کے کوئی ایك بات نہیں کہہ سکتے، انکے آپس کے جھگڑے اور باھمی بے اعتمادی اتنے گہرے ھیں، کہ برٹش گورنمنٹ کو مجبوراً اپنے ھاتھوں میں بہت سے اختیارات رکھنے پڑتے ھیں. یہاں پر گول میز کانفرنس کی باتیں لکھنا بھی میرے لئے ممکن نہیں.

مہاتماجی جب وھاں سے ناامید ہو کر چلے تو هندوستان

میں افسروں نے اس وقت تک ایسی حالت پیـــدا کردی تھی
کہ کانگریس کے دبانے میں وہ اپنی من مانی کرسکیں.
بنگال کی گرفتاریاں، یوپی (صوبہ متحدہ) میں کسانوں کیساتھ
سختیاں اور صوبہ سرحد کی زیادتیاں، ان سب باتوں نے
کانگریس کی کمیٹی کو اس سخت حالت پر غور کرنے کیلئے
مجبور کیا. هملوگ مہاتماجی کی واپسی کا انتظار کرنے لگے. جس
روز وہ جہاز سے بمبئی پہونچنے والے تھے، اس روز وهاں
پر ورکنگ کمیٹی کی نشست مقرر ہو گئی. هملوگ سب کے سب
جگہ جگہ سے بمبئی کیلئے روانہ ہو گئے. پنڈت جواہرلال جی
الہ اباد سے اسی ٹرین میں سوار ہوئے، جس میں میں بھی
تھا. الہ آباد سے تھوڑی ھی دور پر بے جگہ ٹرین ٹھرا کر
جواهر لال جی گرفتار کر لئے گئے. اب یہ بات صاف ہو گئی
کہ گورنمنٹ یہ نہیں چاهتی هے کہ مہاتماجی سے ہم سبلوگ
مشورہ کر سکیں یا خود وہ صلح کا راستـــہ نکالے. وہ تو
اس بات پر تل گئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح سے کانگریس
کو دبانا اور توڑ دینا چاهئے. هملوگ بمبئی پہونچے. جنتا نے
مہاتماجی کا بڑے جوش اور بڑی شان سے استقبال کیا. مہاتماجی

نے اترتے ھی کانگریس کمیٹی سے باتیں کر کے لارڈ ولنگڈن کو تار دیا کہ وہ ان سے ملکر اپنی غیر موجودگی میں پیدا شدہ حالات کے متعلق باتیں کرنی چاھتے ھیں، تا کہ کوئی راستہ نکل آئے. لیکن لارڈ ولنگڈن نے ملنے سے انکار کردیا. لھذا کوئی بات نہ ھو سکی. ھم لوگ سمجھ گئے کہ لڑائی پھر چھڑ گئی. پھر اسی رات کو ھملوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ھو گئے.

بمبئی سے ھملوگوں کے روانہ ھو جانیکے بعد بھی مہاتماجی نے تاروں کے ذریعہ سے بات کرنے کی کوشش نہ چھوڑی، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا. رات کو انکی بھی گرفتاری ھو گئی اور وہ یرودا جیل پہونچا دئے گئے. اسی دن صوبوں میں جتنے بڑے لوگ تھے گرفتار کر لئے گئے. تمام آشرم، کانگریس کے دفتر اور کانگریس کے کام کرنیوالے، دوسرے متعلقہ ادارے، سب غیر قانونی قرار دیدئے گئے. سب اداروں کے بڑے بڑے سب کارکن گرفتار کر لئے گئے. جیل جانے تک ھملوگوں کو کوئی ایسا خاص موقع بھی نہیں ملا کہ کوئی تیاری کرتے یا لوگوں کو کوئی ھدایت دے سکتے. کانگریس کے

کارکن بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ اب ھمکو کیا کرنا ھے. جنتا کو تو کچھ پتہ ھی نہ تھا کہ اس دفعہ کیا پروگرام رھیگا. ھملوگوں نے سنا کہ گورنمنٹ کے افسروں کا یہ خیال تھا کہ ابکی بار یہ ساری تحریك دو چار دن کے اندر ھی ختم کردی جائیگی. لیکن ایسا نہ ھو سکا. جتنی بھی سختی ھو سکتی تھی خوب کی گئی. گورنمنٹ کی یہ تدبیر تھی کہ اگر کوئی کانگریسی جیل کے باھر رہ بھی جائے، تو اسکے پاس کوئی ایسا سرمایہ نہ رہ جائے جسکے ذریعہ سے وہ کام کو آگے بڑھا سکے. اسطرح کانگریسی لوگوں کو اگر کوئی پیسہ بھی دیتا تو اسکی وجہ سے وہ گرفتار کر لیا جاتا، اگر ان کو اپنے گھر میں پناہ دیتا تو اسے سخت سزا ملتی. یہانتك کہ ان کیلئے کرایہ کی سواریاں بھی ممنوع تھیں. تار و ڈاك کو تو وہ کام میں لا ھی نہیں سکتے تھے. اخباروں میں کوئی خبر بھی حتی الامکان چھپنے نہیں پاتی تھی. دوسرے جتنی بھی اشیاء ان کے کام آسکتی تھیں سبھی سے وہ محروم کر دئے گئے. لیکن جنتا میں سنہ ۱۹۳۰ع سے ستیہ گرہ کا اثر باقی تھا. کہ بغیر کسی کے بتائے ھوئے لوگوں نے ستیہ گرہ کے راستے ڈھونڈھ نکالے.

گورنمنٹ کے جو حکم نکلتے تھے وہ اسمیں بہت مدد کرتے تھے. جس بات کو گورنمنٹ منع کرتی تھی، لوگ اسکی مخالفت شروع کر دیتے اور ستیہ گرہ شروع ہو جاتی. تحریک کو دو چار دن کے اندر ختم کر دینے کا ارادہ پورا نہ ہوا، مہینوں تک یہ تحریک تیزی سے جاری رہی. لیکن گورنمنٹ جنتا کی کمزوریوں کو پرکھ چکی تھی، جو کمزور مقام تھا اسی پر اس نے چوٹ دی.

سنہ ۱۹۳۰ع کی تحریک ہی میں جبکہ وہ ختم ہونیوالی ہی تھی، ہم نے ایک کمزوری محسوس کی تھی. لوگ جیل خانے سے نہیں ڈرتے تھے، لاٹھیاں بھی خوشی سے برداشت کر لیتے تھے، کہیں کہیں گولیوں کا مقابلہ بھی انہوں نے بڑی بہادری سے کیا تھا، لیکن گورنمنٹ جب مال اور جائداد پر قبضہ کرنے لگی اس وقت لوگ کچھ ڈرنے لگے. ہم نے اس کا نتیجہ دیکھ لیا اور گورنمنٹ نے بھی اس کمزوری کو سمجھ لیا تھا. اسلئے اس دفعہ گرفتاریوں کے بعد لمبی لمبی سزائیں تو ملتی ہی تھیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ بڑی بڑی رقموں کے جرمانے بھی ہوتے اور سختی سے وصول ہونے لگے. اگر کوئی اپنی گاڑی، خواہ وہ گھوڑا گاڑی ہوتی یا موٹر، ستیہ گرہ

کے کام میں لگا دیتا تھا تو وہ گاڑی بھی ضبط ہو جاتی. اور اگر کوئی اپنے مکان میں ستیہ گرہی کا کام ہونے دیتا تو وہ بھی ضبط ہو جاتا. جو روپیہ بنکونمیں جمع ہوتا وہ اگر ستیہ گرہ کے کام میں لگایا جاتا، تو وہ بھی قرق کر لیا جاتا اور نکاسی بند کر دی جاتی. اس طرح ان تمام باتوں سے راستہ بند کردیا گیا، کہ ستیہ گرہی نہ کہیں آجا سکے، نہ کسی سے روپیہ لے سکے اور نہ کسی کے گھر میں پناہ پا سکے، نہ کسی طرح کے مال پر کوئی اختیار رکھ سکے نہ کوئی سواری ھی کام میں لا سکے. جسپر ذرا بھی شبہ ھوتا وہ ستیہ گرھی سمجھ لیا جاتا، اسپر سختیاں کی جاتیں. نتیجہ اسکا یہ ھوا کہ جو ستیہ گرھی تھے وہ تو نہ دبے، لیکن دوسرے لوگوں نے جو خود تو ستیہ گرھی نہ تھے لیکن ان کے ساتھ ھمدردی کیا کرتے تھے یا ان کو مدد دیتے تھے، انمیں دھشت پیدا کر کے ستیہ گرھیوں کو بے بس کردیا. پھر بھی ملک نے لارڈ ولنگڈن کے چیلنج کا اچھا اور شاندار مقابلہ کیا. گورنمنٹ اس تحریک کو بند نہ کر سکی، لیکن ڈیڑھ سال کے بعد یہ تحریک آھستہ آھستہ دھیمی پڑ گئی. اب گورنمنٹ یہ کہنے کے قابل ہو گئی کہ اس نے ملک کی حالت پر پوری طرح قابو پا لیا.

چوبیسواں باب

مہاتماجی نے اپنی آپ بیتی میں بتایا ھے کہ ان کو بچپن ھی سے اچھوت ادھار کے سوال کا پتہ چل گیا تھا. جب انکو پورا علم ھوا کہ یہ برا طریقہ کتنا غیر انسانی اور غیر فطری ھے، تو اس وقت سے انہوں نے اسکے مٹانے کی تدبیر میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی. جب ھندوستان لوٹ کر پبلک کام انہوں نے شروع کیا تو اس وقت سے «اچھوت پن دور کرنا» اپنے پروگرام کا ایک بڑا جز بنا لیا تھا. اس پر جہاں تک ھو سکا زور دیتے رھے، پھر عملی شکل سے اسے دور کرنے میں مصروف رھے. کانگریس کے پروگرام کا یہ ایک بہت بڑا کام ھوگیا تھا. سیٹھ جمنا لال جی نے تو اسکو اپنا ایک فریضہ بنا لیا تھا، کچھ دنوں تک وہ اسی کام میں لگے رھے. سارے ملک میں کانگریس کی تنظیم جیسے جیسے پھیلتی اور مضبوط ھوتی گئی، اچھوت پن دور کرنے پر زور دیا جانے لگا. ھزاروں سال کا جاری اور قائم یہ برا طریقہ ایک بارگی دور نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن اسمیں شک نہیں کہ اسکی جڑ

هل گئی.

سیاسی وجوہ سے ہندو مسلم مسئلہ بھی پیچیدہ بنتا گیا. خلافت تحریک کے زمانے میں جو منظر دیکھے گئے وہ تھوڑے دنوں کے بعد تقریباً خواب کے مانند بھول سے گئے. آپس کے فساد بہت بڑھ گئے. اگرچہ دیکھنے کیلئے انکی شکل اور وجہ مذہبی ہوا کرتی تھی. کہیں گائے کی قربانی کیلئے، تو کہیں اینٹ پتھر کا پھینکنا محرم کے تعزیہ پر، کہیں مسجدوں کے سامنے باجے بجانے پر اور کہیں کہیں جلوس نکالنے کیلئے بھی. کہیں تو افرادی جھگڑا عام بلوہ کا سبب بن جاتا تھا. جیسے جیسے قومی تحریک زور پکڑتی گئی، ایسا معلوم ہوا کہ اب کچھ سیاسی اختیارات ہندوستانیوں کے ھاتھ میں آنیوالے ھیں، ویسے ھی یہ تدبیر کی جانے لگی کہ اسکے بٹوارے میں کسطرح زیادہ سے زیادہ حصہ لیا جائے، چاھے اسکے حاصل کرنیکی تدبیر اور قربانی میں حصہ لیا گیا ھو یا نہ لیا گیا ھو. اس طرح مسلمانوں کی تنظیم ھوئی، جو اپنی طرف سے دعوی پیش کرنے لگی. اچھوت ذاتوں کی بھی تنظیم ھوئی، جس میں اچھوتوں کی طرف سے بھی دعوی پیش ھوا. انگریزی

سرکار کی پالیسی بھی رھی کہ جب تك ھندوستان کی جماعتوں کے لوگ مل کر مطالبہ پیش نہ کریں وہ کچھ نہیں کر سکتی. اگر کچھ کرتی بھی تو اسمیں ایسی شرط لگا دی جاتی جو سارے ملك کیلئے جھگڑے کا سبب بن جاتی. اسی پالیسی کے مطابق پہلے پہل جب منٹو مارلے اسکیم آئی تو اسمیں برائے نام کچھ نمائندے کونسلونمیں لئے گئے. لیکن کسی مسئلہ میں ھندوستانیوں کے ھاتھ میں اختیار نہیں دیا گیا. اسی کیساتھ مسلمانوں کیلئے حلقہ انتخاب کی ایسی پچڑ لگادی گئی جس سے ملك کے لوگ مسلم اور غیز مسلم دو حصونمیں بانٹ دئے گئے. اور رائے دیکر نمایندہ چننے کا جو تھوڑا بہت اختیار ھندوستانیوں کو ملا وہ ھندوستانی کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلم اور غیر مسلم کی حیثیت سے ملا. اس فیصلہ کی اشاعت کرنیسے قبل مسلمانوں کی ایك جماعت کو ابھار کر اس طرح مطالبہ پیش کرایا گیا. چنانچہ اسی مطالبہ کے جواب میں یہ نفاقی طریقہ اصلاح کے نام سے جاری کیا گیا. لیکن جب اس طرحکی کوئی چیز چل جاتی ھے یعنی جب بیج بویا جاتا ھے تو پھلے بغیر نہیں رہ سکتا. نتیجہ یہ ھوا کہ کچھ دنوں کے بعد

اوروں نے بھی علحدہ حلقہ انتخاب کی مانگ پیش کی، کچھ دوسروں کیلئے بھی الگ حلقۂ انتخاب قائم کئے گئے، جیسے سکھ عیسائی وغیرہ. گول میز کانفرنس میں مہاتماجی کو ایک ایسی حالت کا مقابلہ کرنا پڑا جو پہلے سے تیار کر کے رکھی گئی تھی.

سنہ ١٩٣٠ع کی پہلی گول میز کانفرنس میں خاصکر اسی بات پر زور دیا گیا تھا کہ جو نیا آئین بنے وہ سارے ہندوستان کیلئے بنے. ہندوستان کا ایک وہ حصہ تھا جو انگریزی راج کے نام سے بالکل انگریزی پارلیمنٹ کے ماتحت چلتا تھا. دوسرا وہ حصہ تھا جس میں دیسی رجواڑے انگریزی سلطنت کی ماتحتی مانتے ہوئے اپنی ریاستوں کو اپنے طریقوں سے چلایا کرتے تھے. سوال یہ تھا، کہ دونوں کیلئے ایک آئین بنے، یا صرف انگریزی حصہ کیلئے ہی بنے، اگر دونوں کیلئے بنے تو اسمیں راجواڑوں کا مقام کیا ہو؟ اس کانفرنس میں راجواڑوں کے نمایندے بلائے گئے تھے. جب برٹش سرکار نے سوراج کی لہر سارے دیس میں تیزی سے بڑھتی دیکھی، تو اسکو ایسا معلوم ہوا کہ جہانتک ہندوستان کے انگریزی حصہ کا تعلق ہے اس میں اختیارات دیئے بغیر اب

زیادہ دنوں تک کام نہیں چل سکتا. اس وقت اس نے رجواڑوں کو اپنا آلہ‌کار بنا کر ملك کی حکومت کو اپنے ہاتھونمیں رکھنے کا راستہ سوچا. کچھ رجواڑے اس کے آلہ‌کار بنکر اور کچھ سچ مچ وطن کی محبت سے متاثر ہوکر گول میز کانفرنس میں گئے. گول میز کانفرنس میں وہ سارے ملك کیلئے ایك متحدہ آئین کے موافق ہو گئے. یہ بات پہلے پہل وہیں پیش ہوئی کہ آئین کی شکل ایك متحدہ ہو، جس میں رجواڑے بھی شریك ہوں. چونکہ وہ اپنی اپنی ریاستونمیں اندرونی معاملوں میں زیادہ‌تر آزاد سمجھے جاتے تھے اسلئے وہ یونین میں شریك ہونے کیلئے شرطیں تلاش کرنے لگے. برٹش سرکار دوسری طرف اس فکر میں تھی کہ اگر سارے ہندوستان کی ایك پارلیمنٹ ہو، تو اس میں راجواڑوں کے نمایندے اور برطانوی ہند کے ایسے نمایندے جو قومی تحریك سے ہمدردی نہ رکھتے ہوں، یا جو کسی نہ کسی سبب سے برٹش سرکار کا ساتھ دینا چاھتے ھیں، دونوں مل کر قومی جماعت کو دبائے رکھ سکیں گے. اس طرح سے دیکھنے میں اگرچہ نمایندوں کے ذریعہ سے حکومت ہونے لگے گی

لیکن پھر بھی حقیقت میں اختیار در پردہ انگریزوں کے ھی ھاتھونمیں رھیگا.

سنه ۱۹۳۱ع میں مہاتماجی دوسری گول میز کانفرنس میں گئے. وھاں انہوں نے قومی مطالبوں کے خلاف ایك دیوار کھڑی دیکھی، جو انگریزوں کی نہیں بلکه هندوستانیوں کی تھی اور جسکو انگریزوں ھی نے مدد دیکر تیار کیا تھا. وھاں ھزار کوشش کرنے پر بھی کوئی ایسا راسته نه نکل سکا جسکو سبھی هندوستانی منظور کر لیتے. سب سے بڑھکر مسلمانوں اور اچھوتوں کے لیڈر کانگریس کی مانگ میں شریك نه ھوئے. کچھ لیڈر ایسے بھی چنکر بلائے گئے تھے جو شریك نه ھوتے. ھزار کوشش کرنے پر بھی ایك کانگریسی مسلمان وھاں نہیں بلایا گیا. نتیجه جو ھونیوالا تھا وھی ھوا، آپس کا اختلاف نه مٹا، مہاتماجی کو اپنی ھار ماننی پڑی. اس حیص و بیص میں اچھوتوں کی طرف سے یه مانگ پیش کی گئی که کونسلونمیں انکے لئے جگہیں محفوظ کردی جائیں اور مسلمانوں کی طرح ان کے بھی نمایندے، الگ حلقۂ انتخاب کے ذریعه سے، جس میں اچھوت طبقه کے لوگوں ھی کو امیدوار بننے اور رائے

دینے کا اختیار ہو، قائم کر دئے جائیں.

مہاتما جی چھوت چھات کو ایك گناہ سمجھتے تھے، وہ سماج سے اسے دور کرنیکی سر توڑ کوشش کر رہے تھے. انہوں نے سوچا کہ اچھوتوں کا یہ الگ حلقۂ انتخاب ذات والے ہندوؤں سے ان کو ہمیشہ کیلئے الگ کر دیگا، وہ اچھوت ھی رہ جائیں گے. اس لئے اس چیز کو وہ مذھبی حیثیت سے برداشت نہیں کر سکتے تھے. مخالف لوگ تو یہ جانتے تھے کہ سیاسی وجوہ سے اچھوتوں کو ہندؤونمیں ملا کر مسلمانوں کے مقابلہ کیلئے رکھنا تھا. اس لئے وہ انکو الگ حلقۂ انتخاب دینے کی مخالفت کر رہے تھے. لیکن جو لوگ مہاتما جی کے خیالات سے واقف تھے اور جو ان کی سچائی پر بھروسہ کرتے تھے، ان کے سامنے یہ عیاں تھا کہ اسکو وہ ایك مذھبی سوال سمجھتے تھے اور اسپر مذھبی حیثیت سے غور کرتے تھے، وہ اچھوتوں کو ہندو ذات کا جز مانتے تھے، وہ ان کو بھی اس سماج میں وھی مقام دلانا چاھتے تھے جو دوسری اور ذاتوں کے لوگوں کو حاصل ھے. جب انہوں نے دیکھا کہ الگ حلقۂ انتخاب اس اصلاح کیلئے نقصان‌دہ ہوگا

اور اچھوتوں کو دوسروں سے سیاست میں بھی الگ کردے گا، اس وقت انہوں نے گول میز کانفرنس میں اعلان کردیا کہ برٹش گورنمنٹ نے اگر اس مطالبہ کو منظور کر لیا تو وہ اسے ہرگز نہ مانیں گے، اور اسمیں اگر ان کو جان بھی دینی پڑی تو اسکی بھی بازی لگا دیں گے. اس وقت لوگوں نے اس اہم بیان کا کوئی خاص مطلب نہیں لیا اور نہ اسکو کوئی اہمیت ہی دی. اگر اسکی طرف کسی کا دھیان گیا بھی تو اس نے سمجھ لیا کہ یہ محض زبان کا چٹخارہ ہے، اور زوردار الفاظ میں اس مطالبہ کی مخالفت کرنے کا ایک طریقہ، اس سے زیادہ یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا. لیکن مہاتماجی نے سمجھ بوجھکر ان لفظوں کو کہا تھا، وہ حرف بحرف ان کو پورا کرنے کا ارادہ کر چکے تھے.

جب آپس میں فرقہ دارانہ مسئلوں پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو وزیر اعظم میکڈانل نے اعلان کردیا کہ اس مسئلے کا فیصلہ وہ خود ہی طے کرینگے. کچھ دنوں کے بعد وزیر اعظم نے اپنا فیصلہ دیدیا. اس میں ایک بات یہ تھی کہ پست اقوام کیلئے کونسلوںمیں صرف جگہیں ہی نہیں محفوظ کی جائینگی بلکہ

ان کیلئے ایک حلقۂ انتخاب بھی قائم کیا جائیگا، اور ان حلقونمیں صرف پست اقوام ھی کے لوگ ھی امیدوار بن سکیں گے اور رائے دے سکیں گے. یہ فیصلہ وزیر اعظم میکڈانل کے اوارڈ[1] یعنی پنچایتی فیصلہ کے نام سے مشہور ہوا، لیکن حقیقت میں یہ پنچایتی فیصلہ نہیں تھا. کیونکہ پنچایتی فیصلہ وھی دے سکتا ھے جسکو مدعی اور مدعی علیہ نے خوشی سے پنچ بنایا ہو. لیکن شری رمزے میکڈانل کو ھندوستان کے مختلف الخیال جماعتوں کے نیتاؤں نے اور خاصکر گاندھی جی نے، جو ملک کی سب سے بڑی عوامی جماعت یعنی کانگریس کے نمایندے تھے، کبھی پنچایت کی موافقت نہیں کی تھی. وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ جو چاھیں فیصلہ دے دیں، اس کا ان کو اختیار تھا. انکا یہ فیصلہ اسی قسم کا تھا. پنچایتی فیصلے، اور کسی حاکم کے فیصلہ میں جو فرق ھے، اسکو یاد رکھنا ضروری ھے. حاکم کے فیصلے کو ماننے کیلئے کوئی فریق مجبور نہیں ھے. اگر وہ کسی طرح سے اسے

---

۱ — انگریزی لفظ ”Award“ کے لفظی معنی حکم دینے کے ھیں لیکن اصطلاح میں پنچ کے آخری فیصلہ کو «اوارڈ» (Award) کہتے ھیں.

توڑوا سکے، بدلوا سکے یا رد کروا سکے، تو اسمیں کوئی سیاسی نقص نہیں مانا جاتا. اسلئے دونوں فریقوں کو حاکم کے فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا حق قانونی طور پر دیا گیا ھے. لیکن پنچ تو سبھی فریقوں کی مرضی سے مقرر کیا جاتا ھے. سیاسی حیثیت سے اس کے فیصلے کو ماننا سب فریقوں کیلئے واجب اور مناسب ہوتا ھے. اسلئے قانون میں بھی پنچ کے خلاف اپیل نہ ہوگی، جب تک یہ صاف ثابت نہ ہو جائے کہ پنچوں نے بے ایمانی کی ھے یا اپنے اختیار سے باہر ہو کر اس بات کا فیصلہ کیا ھے جو پنچایت میں پیش نہیں ہوئی تھی. یہ اتنا کہنا اسلئے ضروری ہو گیا کہ آئندہ چل کر جب گاندھی جی نے اس فیصلہ کی مخالفت کی تو سیاسی حیثیت سے اسمیں کوئی خرابی کی بات نہیں تھی. اس فیصلہ کو پنچ کا فیصلہ کہنا ھی غلط تھا کیونکہ انہوں نے کبھی پنچایت مانی ھی نہیں تھی.

خیر اس فیصلے میں، جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے، پست اقوام کیلئے علحدہ حلقہ انتخاب قرار دیا گیا، جس کے خلاف، جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ھے، مہاتماجی نے جان کی بازی لگا کر لڑائی کیلئے گول میز کانفرنس ھی میں کہہ دیا تھا.

فیصلہ میں ایك بات یہ بھی تھی کہ سارے فریق، جن کا اس کے کسی جز سے تعلق تھا، اگر ایك رائے ہوکر اسکو بدلوانا چاھیں گے تو وہ بدلا بھی جا سکتا ھے. یرودا جیل میں جب مہاتماجی کو اخباروں سے فیصلہ کی خبر ملی، تو انہوں نے گورنمنٹ کو لکھا کہ اچھوتوں کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا ھے اس کا یہ جز بدلنا چاھئے، اور گورنمنٹ اگر اسپر راضی نہ ہوگی تو ان کو اپنی جان کی بازی لگا کر اسکی مخالفت کرنی پڑی گی. گورنمنٹ نے اس بات پر دھیان نہ دیا. کافی خط و کتابت کے بعد جیل کے اندر ھی انہوں نے اعلان کردیا کہ جب تك وہ حصہ بدلا نہیں جائیگا وہ اس وقت تك روزہ رکھیں گے. روزہ شروع کرنیکی تاریخ کا بھی انہوں نے اعلان کردیا اور مقررہ تاریخ پر روزہ شروع بھی کردیا. اس خبر کے پھیلتے ھی سارے ملك میں ھلچل مچ گئی. پنڈت مدن موھن مالوی، شری راجگوپال اچاری بڑے بڑے نیتاؤں نے بمبئی میں ایك کانفرنس طلب کی. اس میں پست اقوام کے لیڈر ڈاکٹر امبیدکر اور دوسروں کو بھی بلایا گیا. سارے ملك کے بڑے بڑے کانگریسی کارکن، جو اس وقت جیل کے باھر

تھے، کانفرنس میں شریک ہونیکے لئے بمبئی پہونچگئے۔

اس وقت سوال یہ تھا کہ پست اقوام کے لیڈر سے مل کر کوئی ایسی بات طے کی جائے جسے مہاتما گاندھی جی منظور کر لیں، اور اسی کے اعتبار سے شری میکڈانل کا فیصلہ بدلوایا جائے اور مہاتما جی روزہ توڑ دیں۔ یہ امید تھی کہ شرط پوری ہو جانے پر وہ اپنا روزہ توڑ دینگے۔ لیکن شرط کے پورے ہونے میں بہت دشواری دکھائی دیتی تھی۔ کئی دن بمبئی میں باتیں ہوتی رہیں، اسکے بعد یہ سوچا گیا کہ پونا ھی میں چل کر گفتگو کرنی مناسب ہوگی، اور جہاں مہاتما جی سے ملنے کا بھی موقع رهیگا اور ساری باتیں انسے پوچھی جا سکیں گی۔ گورنمنٹ نے بھی ان سے ملنے کی اجازت بڑے لوگوں کو دیدی۔ اسکے علاوہ دوسرے قسم کی آسانیاں بھی مل گئیں۔ کئی دن تك گفتگو کے بعد ایك راستہ نکلا، علحدہ حلقۂ انتخاب کو چھوڑ دینے کیلئے ڈاکٹر امبیدکر راضی ہو گئے۔ لیکن انہوں نے دو شرطیں لگائیں۔ ایك یہ کہ علحدہ حلقۂ انتخاب نہ ہونیکی صورت میں ان کیلئے کونسلوںمیں ان کی تعداد کے اعتبار سے جگہیں محفوظ ہونی چاهئیں۔ دوسری یہ کہ دس

سال کیلئے یہ مان لینا چاہئے کہ آخری انتخاب اگرچہ سب مل کر کرینگے، لیکن پھر بھی ہر ایك جگہ کیلئے چار امیدواروں کو پست اقوام کے لوگ ہی چنکر انکا نام دیں، اب انہیں میں سے ایك کو سب مل کر منتخب کریں. کئی دن تك صبح و شام مہاتما جی سے باتیں ہوتی رہیں:

مہاتما جی چارپائی پر لیٹے لیٹے آم کے درخت کے نیچے بات کرتے رہے. سبلوگ، جو جیل کے اندر جاتے، چارپائی کے چاروں طرف بیٹھکر یا کھڑے ہوکر انکی باتیں سنا کرتے. اس وقت جس صبر و تحمل کے ساتھ وہ باتیں کرتے تھے وہ دیکھنے کے قابل تھا. ساتھ ہی ان کے ہر ایك لفظ سے یہ ٹپکتا تھا کہ اپنے اس روزے سے وہ ذات والے ہندوؤں کیلئے کوئی سیاسی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے، بلکہ ان کو پست اقوام کی حالت کے متعلق ہی فکر تھی. وہ چاہتے تھے کہ چھوت چھات جلد سے جلد جڑ سے جاتی رہے. لیکن الگ حلقۂ انتخاب کے ذریعہ وہ مستقل بن جاتی تھی. انہیں باتوں کو انہوں نے کئی بار بہت ہی زور سے اور دردناك لفظونمیں ڈاکٹر امبیدکر سے کہا. آخر میں وہ بھی پگھل گئے

اور سمجھوتہ ھو گیا. اسکے لئے مہاتماجی روزانہ گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے. ایسا معلوم ھوتا تھا کہ انمیں ایک عجیب قوت آگئی ھے، جو روزے کے دنونمیں انکو اس قابل بنا دیتی ھے کہ وہ گھنٹوں بڑے بڑے مسائل پر بھی باتیں کرتے رھیں. لیکن پھر بھی جسمانی کمزوری تو دن بدن بڑھتی ھی جاتی تھی، جسکا پتہ ان کی اس آواز سے لگتا تھا جو دھیمی ھوتی جا رھی تھی. اس سمجھوتے سے پست اقوام کو ایک بڑا نفع یہ ھوا کہ ان کو جتنی جگہیں شری میکڈانل کے فیصلہ سے ملی تھیں اس سے کہیں زیادہ مل گئیں. شری امرت لال ٹھپکر نے، جو اس مسئلہ میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے، انکی تعداد نکال کر بتادی کہ ان کو کتنی جگہیں ملنی چاھئیں. سمجھوتہ ھوتے ھی گورنمنٹ کو اطلاع کردی گئی. اس نے تمام باتیں تاروں کے ذریعہ وزیر اعظم میکڈانل کو بھیج دیں. وھاں سے چند گنھٹوں کے اندر ھی جواب آ گیا کہ انھوں نے اپنے فیصلے کا وہ حصہ، جسکے متعلق مہاتماجی نے روزہ رکھا تھا، رد کردیا، اور اسکی جگہ یہ سمجھوتہ مان لیا. یہ اطلاع گورنمنٹ نے جیل میں پھونچا دی. اس وقت مہاتماجی نے

اپنا روزہ ختم کیا. آپس کی اس گفتگو میں تمام شریك هونیوالے، روزہ ختم هونیکے وقت پونا میں موجود تھے. ان کے علاوہ «کوندر رونڈ» ٹھیك اسی وقت پونا پہونچگئے، اس قربانی میں انہوں نے بھی حصہ لیا. مہاتماجی نے اپنے تمام روزوں کو ایشور کا نام لیکر هی شروع اور اسی کی عبادت کے ساتھ ختم کیا. اس موقع پر بھی ایسا هی هوا. اسکی عمدہ تفصیلات «کوندر روند» نے اسی وقت لکھی تھیں.

اس وقت اس سمجھوتے میں ایك شرط یہ بھی تھی کہ ذات والے هندو اچھوت پن دور کرنے کی تدبیر کرینگے، اور پست اقوام کو ترقی دینے میں معاون هونگے. سمجھوتہ هوجانے پر هم سب پونا سے بمبئی آئے اور وهاں هریجن سیوك سنگھ کی بنیاد ڈالی، جو اسوقت سے آجتك اسی کام میں لگی هوئی هے. مہاتماجی نے جیل سے هی اچھوت سدھار کے متعلق مضمون لکھنے شروع کئے. گورنمنٹ نے بھی ان مضمونوں کو نہیں روکا. جو لوگ باهر رہ گئے تھے انہوں نے پورے جوش سے چھوت چھات دور کرنے کا کام شروع کیا. صرف «هریجن سیوك سنگھ» کی بنیاد هی نہیں پڑی، بلکہ سبھی جگہوں

پر اس بات کی کوشش بھی پوری قوت سے کی جانے لگی. کہ اچھوت پن دور کرنے کے لئے کون سی عملی صورت اختیار کی جائے. ایک کوشش اس تدبیر کی یہ ھوئی کہ جن مندروں اور شوالوں میں اچھوت لوگ درشن اور پوجا کے لئے نہیں جانے پاتے تھے، وہ ان کے لئے کھول دئے گئے اور وھاں انہیں درشن اور پوجا کی آسانیاں دی جانے لگیں. اس کے پہلے کئی جگھوں پر ایسی تدابیر کی گئی تھیں، کئی جگہ اس کے لئے ستیہ گرہ بھی ھوئی. اب ھمارے پروگرام میں بہت قوت پیدا ھوگئی تھی اور کام زور سے چلنے لگا. کچھ دنوں بعد مہاتماجی نے یرودا جیل ھی میں اسکے متعلق اکیس دن کا روزہ رکھا تھا، جو کفارے ھی کی شکل میں تھا. میں اس وقت هزاری باغ جیل میں تھا، وھاں پر یہ اطلاع پا کر کئی آدمیوں نے اکیس دن تک صف پھل کھائے، کہیں کہیں کچھ لوگوں نے تو روزہ بھی رکھا. یہ ایك ایسا اچھا موقع تھا، جو سارے ملك کو خاصکر ھندو جات کو اچھوت کے سوال پر سوچنے کا اور اس طریق کار کے متعلق فرض پورا کرنے کا موقع ملا. اس روزے میں مہاتماجی نے اس مسئلہ کے حل

کرنے کو سماجی مسئلہ کی سطح سے اٹھا کر ایک مذھبی عہد کی سطح پہونچا دیا۔ اسی کا نتیجہ یہ ھوا کہ سارے ھندو سماج میں اس سے ھلچل مچگئی۔ نتیجہ یہ ھوا کہ آج اچھوت‌پن اپنے قلعہ کے ایک ایک کونے سے نکلا جا رہا ہے۔

مہاتماجی نے جیل سے لکھنا جاری رکھا۔ اسمیں جب کوئی مشکل اور رکاوٹ پیدا ھونے لگتی تو وہ پھر روزہ رکھ لیا کرتے۔ جسکا اچھا نتیجہ یہ نکلا کہ گورنمنٹ نے مجبور ھوکر ان کو چھوڑ دیا۔ جیل سے نکلنے پر انہوں نے کسی سیاسی کام میں ھاتھ نہیں ڈالا۔ وہ اپنے خیال سے ابھی جیل ھی میں تھے۔ جو کچھ وہ جیل سے کر سکتے تھے، سیاسی حیثیت سے اسی قدر انہوں نے کرنا مناسب سمجھا۔ کیونکہ ان کو اچھوت‌پن دور کرنے کے متعلق کام کرنیکی اجازت جیل میں بھی تھی، اسلئے انہوں نے جیل سے باھر آنے کے بعد بھی اسکو پوری قوت سے چلایا۔ اپنے اخبار میں مضمون لکھنے کے علاوہ انہوں نے ملک کا دورہ بھی کرنا شروع کیا۔ ستیہ گرہ کی تحریک آھستہ آھستہ دھیمی پڑنے لگی۔ پھر مہاتماجی کو کوئی ایسا اشارہ ملا کہ اب اسکو زیادہ چلانا

مناسب نه تھا. آخر میں پہلی تحریک ملتوی کردی گئی.

لیکن وہ پہلے ھی کی طرح سے سواری، موٹر، اور ریل پر دورہ کرتے رہے. اس دورے میں انہوں نے ملک کے مختلف صوبوںمیں اچھوت پن دور کرنے کی باتیں بتائیں. سناتن دھرم خیال کے ھندوؤں نے ان کی بہت مخالفت کی، کچھ پنڈت عالموں نے شاستروں کے ذریعه ان کی تائید بھی کی، کہیں کہیں دونوں فریقوں کے شاستری مقابلے بھی ہوئے. ایک طرح سے ھندو سماج میں ھل چل مچگئی. اسی وجه سے خفا ھوکر پونا میں کچھ لوگوں نے مہاتماجی پر، جبکه وہ ایک جلسے میں جا رہے تھے، زھریلا بم پھینکا، لیکن خوش قسمتی سے وہ بچ گئے. ان کے دورے میں مہاسبھائیوں نے بہت رکاوٹ ڈالی. چنانچه وہ جہاں جاتے، وھیں وہ ستیه گرہ کرتے، یعنی ان کو جلسے سے روکنے کی تدبیر کرتے. اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے انتظام کرنیوالے لوگ بہت سی تدبیریں کرتے، لیکن وہ مہربان پیچھا نه چھوڑتے تھے. پونا کے علاوہ اور کئی جگہوں پر بھی مہاتماجی پر حملے کئے گئے، کہیں کہیں معمولی چوٹ بھی آئی. لیکن وہ اپنے عہد پر قائم رہے اور دورہ

کرتے ھی رھے. آخر میں انہوں نے اڑیسہ پہونچکر یہ ارادہ کیا کہ پیدل ھی دورہ کرنا چاھئے، اس لئے وہ کچھ دنوں تك صوبہ میں پیدل ھی دورہ کرتے رھے. صوبہ کے ایك بڑے حصہ میں اسی طرح وہ پیدل پھرے.

جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے، اس زبردست تدبیر سے چھوت چھات کے قلعہ کی دیواریں ٹوٹنے لگیں. اگرچہ آج بھی یہ کہنا صحیح نہ ھوگا کہ چھوت چھات اٹھ گئی، لیکن پھر بھی یہ کہنے کے مستحق ھیں کہ جیسے ایك پودا جڑ سے ھلا دیا جائے اور اکھاڑ کر نہ پھینکا جائے، پھر بھی وہ سوکھنے لگتا ھے، اسکا ایك ایك پتہ سوکھتا جاتا ھے، اسکی ٹہنیاں سوکھتی جاتی ھیں، آخر میں وہ مرجھا جاتا ھے. اسی طرح سے چھوت چھات کی جڑ ھل گئی، اسکی پتیاں اور ٹہنیاں سوکھتی جا رھی تھیں، اسکی جڑونمیں یہ طاقت نہیں ھے کہ زمین، آسمان اور پانی سے اپنے تئیں قائم رکھنے کیلئے پرورش کے قابل چیزیں لے سکے. اور جب پودا ان پرورش دینے والی چیزوں سے محروم ھو جاتا ھے تو اکثر اسے سوکھنا ھی پڑتا ھے. اسی طرح اس برے طریقہ کو اب مرجانا ھی ھے.

کیونکہ یہ برا دستور محض ایك پودا ھی نہیں ھے. بلکہ ہزاروں سال کا پالا پوسا ھوا ایك بہت بڑا درخت ھے، جس نے بہت دور تك گہرائی میں اپنی جڑوں کو پھیلا رکھا ھے. اسلئے اسکے ھل جانے کے بعد بھی اس کے دفعتاً سوکھ جانے میں ابھی وقت لگے گا. اسکی موجودہ حالت اس بڑے درخت کی ھے جو بڑے طوفانمیں اکھڑ کر گر جاتا ھے. لیکن گر جانے کے بعد بھی اس کا کچھ نہ کچھ تعلق زمین کے ساتھ رہ جانیکی وجہ سے وہ ھرا رھتا ھے پھر بھی اسمیں حقیق جان نہیں رہ جاتی. اسیطرح یہ درخت گر گیا ھے لیکن ابھی بے جان نہیں ھوا.

مہاتما جی اس مسئلہ کو مذھبی مسئلہ کی شکل میں دیکھتے تھے. لیکن ساتھ ھی پست اقوام کی غیر مذھبی حالت کو بھی وہ بھولے نہیں تھے. وہ چاھتے تھے کہ ان کی مالی حالت بھی سدھرے. انمیں اور دوسرے ھریجنوں میں اس مسئلہ میں کچھ اختلاف بھی تھا. کچھ ھریجنوں کا، خاصکر جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا، اور جو صرف مالی ترازو پر ھی سب کچھ تولنا جانتے ھیں، یہ خیال تھا کہ اگر ان کی سیاسی اور مالی حالت

سدھار دی جائے، تو سماج میں ان کا جو مناسب مقام ھے وہ
ان کو خود بخود مل جائیگا. اس لئے وہ لوگ مندروں اور
دیولوں کو کھلوانے کی کوششوں کو اتنی اھمیت نہیں دیتے جتنی
مہاتماجی دیتے تھے. ان لوگوں کا خیال تھا کہ مندروں کی بجائے
ھریجنوں کیلئے اسکول کھلوانے، زیادہ نوکریاں دلوانی، اور دوسری
طرح سے مالی حالت سدھارنی زیادہ ضروری ھے. لیکن مہاتماجی
ان مسئلوں کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں رکھتے تھے. اچھوتوں
کو سماج میں دوسرے ھندوؤں کے برابر مقام دلوانا، اور مذھبی
معاملات میں وہ ان کی ترقی بھی، اتنی ضروری سمجھتے تھے.
اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے خیال میں انسانی رشتے سے کسی
بھی انسان کو اچھوت ماننا، یا اسے دیو درشن کا اختیار نہ دینا،
اچھوتوں کے باریمیں اور جو اچھوت پن مانتے ھیں ان کیلئے بھی،
پاپ ھے. اس لئے جب تک سماج اس گناہ سے نجات نہیں
پا جائیگی اس وقت تک اسکی حالت بھی نہیں سدھر سکتی.
ھریجن اس سماج کے جز ھیں، ھریجن کو جتنا سدھارنا چاھئے اتنا
نہیں سدھارا جا سکتا. مہاتماجی اپنے کام میں لگے رھے. جس
طرح انہوں نے سناتن دھرمیوں کی مخالفت کی پرواہ نہ کی ویسے ھی

ہریجنوں کی مخالفت سے بھی وہ اپنے خیالات سے پیچھے نہیں ہٹے. اب تو سارا ملک یہاں تک ایک رائے پر پہونچگیا ھے کہ اس وقت کے آئین نے اچھوت پن کو ایک قصور یا جرم قرار دیدیا ھے، اور حکومت کا یہ فرض بتایا ھے کہ وہ اچھوت پن کو فنا کردے.

اس کے علاوہ پست اقوام کی ترقی کیلئے اس خاص وزیر پر یہ بوجھ ڈالا جائیگا جو اس مسئلہ پر غور کرےگا. اور اس کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ان قاعدوں اور قانونوں کی پابندی کرائے جو اچھوت پن دور کرنے کیلئے بنائے جائیں گے. وہ ہر حیثیت سے سبھی ذاتوں کی تعلیم اور ہر ایک حیثیت سے ان کی ترقی کیلئے ہمیشہ دورہ کرتا رھیگا. دس سال کے بعد ایک کمیشن بنےگا جو ان کی اور دوسری پست ذاتوں کی حالت کی جانچ کرکے حکومت صدر کے سامنے سبھی باتوں کی رپورٹ پیش کریگا. اور وہ رپورٹ پارلیمنٹ میں غور کرنے کیلئے پیش کی جائیگی. پھر ان سبلوگوں کیلئے، جن کیواسطے علحدہ حلقۂ انتخاب اور کونسلونمیں مقررہ جگھیں محفوظ رکھی گئی ھیں، نئے قانونوں میں وہ سب باتیں منسوخ کردی جائینگی.

اچھوت طبقہ اور دوسری پست اقوام کیلئے ابھی دس برس تک جگہیں محفوظ رکھی جائینگی. اس طرح نئے آئین میں اور لوگوں کے برابر لانے کیلئے، انکو جہانتک آئین وقاعدے سے ہو سکتا ھے، کوشش کی گئی ھے. گورنمنٹ کوئی بھی ہو اور خواہ کسی جماعت کی ہو، اسکو آئینی قاعدوں کے مطابق ھی کام کرنا ہوگا. اسمیں شک نہیں کہ جو کچھ اچھوت پن رہ گیا ھے اسکو دور کرنے میں، اور پست ذاتوں کو دوسروں کے برابر لانے میں، یہ قاعدے بہت کام دیں گے. لیکن نئے آئین اور آئندہ کیلئے ھی یہ پروگرام نہیں بنا ھے. جو کچھ پچھلے کئی سال سے ہو رہا ھے اور جن کے مطابق کانگریسی سرکاریں کام کرتی چلی آ رھی ھیں، انہیں باتوں کو نئے آئین میں ایک مکمل روپ دینے کی تدبیر کی گئی ھے. جب سے مہاتما جی نے زور لگایا اسی وقت سے سبھی کانگریسی، جنکا کسی جگہ اس سے کچھ بھی تعلق ہوا ھے، اس کے دور کرنیکی تدبیر میں لگے ہوئے ھیں. نتیجتاً کئی صوبونمیں خاصکر جنوب میں، جہاں یہ سوال بہت ھی سخت اور خوفناک شکل اختیار کئے ہوا تھا، قانون کے ذریعہ مندروں اور شوالوں میں ہریجنوں

کا داخلہ کرا دیا، اس کیلئے قانون بھی بن گئے. ان کیلئے سبھی مقامات پر مخصوص وظیفہ دیکر اسکول کھول کر اور دوسرے طریقوں سے بھی تعلیم کیلئے ہمت افزائی کی جا رہی تھی، ان کو نوکریاں بھی دی جا رہی تھیں. اگرچہ ابھی تعلیم کی کمی کی وجہ سے سب جگہوں کیلئے ان میں سے قابل امیدوار نہیں ملتے، اور جتنی جگہیں انہیں ملنی چاهئے تھیں ابھی نہیں ملی ھیں. سنه ١٩٣٧ ع ھی میں جب کانگریس پہلے پہل کئی صوبوںمیں وزارت بنا سکی تو ہریجن وزیر بھی مقرر ہوئے. اور اس وقت بھی تقریبا سب صوبوںمیں ھیں، مرکز میں تو ایسے دو وزیر ھیں. اس طرح بہت تیزی کیساتھ فضا قائم ھو رھی ھے. اور جو فضا ہزاروں برس تک مشہور رھی وہ اب آهسته آهسته ختم ھوتی جا رھی ھے. اسمیں شك نہیں که اس برے دستور کا میدان ھی نیست و نابود ھو جائیگا.

پچیسواں باب

جب سنہ ۱۹۳۰ع میں مہاتماجی سابرمتی آشرم میں نمک کا قانون توڑنے کی خاطر ستیہ گرہ شروع کرنے کیلئے ڈانڈی جانے کو نکلے تھے، اسوقت انہوں نے کہا تھا کہ وہ آشرم میں سوراج لیکر ہی لوٹیں گے۔ یہ بات مضبوط ارادے کیساتھ انہوں نے کہی تھی۔ اس کا ایک ثبوت ہمکو اس وقت ملا جب اسکا استعمال انہوں نے وزیر اعظم میکڈانل کے فرقہ وارانہ فیصلے کے بدلوانے کے سلسلے میں کیا تھا، جو ہریجنوں کے علحدہ حلقۂ انتخاب کے متعلق تھا۔ اس وقت ان کی بات پر کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اور نہ کسی نے یہ سوچا تھا کہ اس ڈانڈی جاترہ میں اگر وہ سوراج حاصل نہ کرسکے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس آشرم کو، جسے انہوں نے کتنی محنت اور امید کے ساتھ بنایا تھا اور جہاں انہوں نے اپنے نمونے کے بہترین خادم تیار کرنیکی تدبیر کی تھی، وہ ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیں گے۔ لیکن وہ جب اس طرحکی باتیں کہتے تھے وہ سوچ بچار کے بغیر نہیں کہتے تھے۔

ایک بار کسی بات کے کہدینے پر اسے وہ کبھی نہیں بھولتے، بلکہ وہ اسکو پورا کر کے ہی چھوڑتے تھے. اس لئے جب سنہ ۱۹۳۱ع کے شروع میں وہ جیل سے نکلے تو برابر ادھر ادھر سفر ہی کرتے رہے. اسکے بعد گول میز کانفرنس سے واپسی پر جیل میں پھر بند کر دئے گئے. جیل سے نکل کر وہ ہریجن خدمت اور بہار کے قحط زدوں کی مدد کیلئے سفر کرتے رہے. بہار میں کچھ دنوں تک ٹھہرے بھی اور سابرمتی نہیں گئے. سابرمتی کی ایک شاخ وردھا میں کئی سال سے شری ونوباجی کی نگرانی میں چل رہی تھی، مہاتماجی ہر سال وہاں کچھ دنوں کیلئے جا کر ٹھہرا کرتے تھے. جب ہریجن جاترہ ختم ہوئی تو انہوں نے وردھا میں جا کر رہنے کا ارادہ کیا. کچھ دنوں وردھا میں سیٹھ جمنالال بزاز کے باغ میں ٹھہرے رہے. وهیں پر گاؤں سدھار سنگھ کی بنیاد ڈالی اور چرخہ سنگھ کے کام کا طریقہ بہت کچھ بدل دیا. سنہ ۱۹۳٤ع سنہ ۱۹٤۲ع تک وردھا یا وهاں سے چار میل «سے گاؤں» میں رہ کر انہوں نے کامیابی سے کام کو بہت بڑھایا. «سے گاؤں» ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جسمیں سیٹھ جمنالال جی کا بھی حصہ تھا. اسی سے

« سے گاؤں » کا نام بعد میں سیوا گرام پڑ گیا، جو آج دنیا میں مشہور ھے. یہ چار سال کا زمانہ خاصکر تعمیری کام میں ھی لگایا گیا. اس پروگرام میں ایک ایک مسئلہ کو لیکر انہوں نے ملک کو راستہ دکھایا.

هریجن سیوک سنگھ کا ذکر اوپر آ چکا ھے. اس کے سکریٹری شری ٹھکر بابا اور اسکے صدر سیٹھ گھن شیام داس برلا تھے. اور اسکا صدر دفتر دھلی میں قائم ھوا اور آج بھی وھیں ھے، لیکن سارے کام کی ھدایت مہاتما جی سے اسے ملتی رھی. مہاتما جی نے اسے اپنا ایک دستور بنا لیا تھا. اور جہاں کہیں وہ جاتے اور رھتے ھریجنوں کیلئے چندہ جمع کرتے. اسکے لئے انہوں نے کئی طریقے نکالے تھے. جب کبھی وہ سفر میں جاتے تو ان کے درشنوں کیلئے جو بھیڑ ھوتی، اس سے ھاتھ بڑھا کر چندہ مانگتے. ریل کے اسٹیشنوں پر جہاں گاڑی کھڑی ھوتی تو لوگ جمع ھی ھو جاتے تھے. بس مہاتما جی کا ھاتھ ڈبہ کے باھر نکل آتا، لوگ چندہ دینے لگتے. شام کے وقت برابر پرارتھنا کیا کرتے تھے جسمیں سبلوگ موجود ھوتے تھے اور بڑا مجمع ھوتا تھا،

اس موقع پر بھی وہ چندہ جمع کرتے. کچھ دنوں سے دستخط لینے کا دستور ہو گیا تھا. بہت سے لوگ بڑے بڑے لوگوں سے دستخط لینا چاہتے ہیں. مہاتما جی نے قاعدہ بنا لیا تھا کہ وہ پانچروپے لئے بغیر اپنے دستخط کسی کو نہ دیں گے. اس سے دستخطوں کی مانگ تو کم ہو گئی لیکن پھر بھی اس سے کچھ نہ کچھ چندہ آ ہی جاتا تھا. ان کو بھی یہ نہیں کہنا پڑتا تھا کہ وہ تھوڑے لوگوں کو دستخط دینگے، سب کو نہیں دینگے. جو کوئی فیس داخل کر دیتا اسکو دستخط مل جاتے. جو نہیں داخل کرتا وہ چاہے کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو اسکو دستخط نہیں ملتے. مالدار لوگ پانچروپے کے بجائے بہت رقم دیکر دستخط لے لیتے. ان طریقوں سے وہ سال بھر میں بڑی اچھی رقم جمع کر لیتے تھے جو ہریجن سیوک سنگھ کو دے دیا کرتے. ہریجن نام کا ہفتہ وار اخبار انگریزی اور تھوڑا بہت نام بدل کر ہندی، گجراتی، مرھٹی، بنگالی اور اردو میں برابر نکلتا رہا. ان کا طریقہ تھا کہ وہ ہریجن میں خود بہت لکھا کرتے اور جو کچھ دوسرے لوگ لکھتے تھے وہ بھی بغیر اچھی طرح

جانچ کئے ہوئے چھاپا نہیں جاتا تھا.

کھادی کے کام میں وردھا میں بیٹھکر ایک نئی حقیقت کا پتہ چلا. جب انہوں نے تلاش کر کے چرخہ نکلوایا اور اسکو سابرمتی آشرم میں چلوانا شروع کیا، تو ملک کی حالت یہ تھی کہ بہت سی جگہوں پر چرخے چلتے تھے، جنکے ذریعہ تیار کئے ہوئے سوتوں سے بہت سی قسم کے کپڑے بنا کرتے تھے. بہت سی جگہونمیں تو موٹے ھی سوت نکلا کرتے تھے، جن سے موٹے کپڑے ھی تیار ہوا کرتے تھے. پنجاب کے بہت سے گھرونمیں چرخے چلا کرتے تھے، لیکن سوت زیادہ تر کھیس جیسی اشیاء کے بننے ھی میں خرچ ہوتا تھا. راجپوتانہ میں بھی زیادہ تر موٹا کپڑا ھی بنا جاتا تھا. لیکن کہیں کہیں باریک سوت بھی ہوتا تھا، جیسے آندرہ میں. وھاں کے باریک سوت کا کپڑا بہت ھی مشہور تھا. اسی طرح بہار میں ایک خاص قسم کی روئی ہوا کرتی تھی جسکا رنگ بہت ھی اچھا ہوتا تھا. اس سے بہت باریک سوت کات کر بہت ھی ملائم اور خوش رنگ کپڑا بنا جاتا تھا، جسے وھاں "کوکٹی" کہتے تھے. نیپال میں کوکٹی کی بہت عزت تھی،

خاصکر نیپال راج سے ملے ہوئے ضلع دربھنگہ میں کوکٹی بہت بنی جاتی تھی۔ نیپال کی ہمت افزائی سے یہ کپڑا چلتا رہا۔ لیکن اس سب کے باوجود یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ چرخہ تقریباً غائب ہو چکا تھا اور روز بروز غائب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کارگاہوں کی حالت اتنی گری ہوئی نہیں تھی۔ اگرچہ وہ بھی کم ہوتے جا رہے تھے۔ بہار میں گورنمنٹ نے سنہ ۱۹۲۱ع کی مردم شماری کیساتھ کارگاہ کا بھی حساب لگایا، جس سے یہ پتہ چلا کہ صوبہ بہار میں تقریباً پانچ کروڑ روپے کا کپڑا کارگاہوں پر بنا جاتا ہے، لیکن سوت زیادہ تر مل کا ہی ہوا کرتا تھا۔ اس طرح دوسرے صوبوںمیں بھی کارگاہوں پر بہت کپڑا بنا جاتا تھا۔ اندازہ یہ ہے کہ اس وقت جتنا کپڑا ملک میں تیار ہوتا تھا اس کا ایک چوتھائی سے ایک تہائی تک ہاتھ کے کارگاہوں پر ہی تیار ہوا کرتا تھا۔ مہاتماجی نے دیکھا کہ اگر چرخہ کی ہمت افزائی نہ کی گئی تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ کرگے بھی بند ہو جائینگے۔ کیونکہ کارخانوں کو سوت تیار کرکے کپڑے بن لینے میں زیادہ نفع تھا۔ صرف سوت کی کتائی میں اتنا نفع نہیں تھا، اسلئے ضرور وہ صرف سوت کی کتائی کم

کر دینگے، اور کتائی بنائی دونوں کرنے لگیں گے. اس کا نتیجہ
یہ ہوگا کہ ہاتھ کے کرگوں کیلئے ملوں سے سوت ملنا کم ہوتا
جائیگا جو آخر میں بند ہو جائیگا. اسلئے انہوں نے یہ سوچ
لیا تھا کہ کرگوں کو بھی اگر زندہ رکھنا ھے تو پھر سے چرخہ
چلانا ضروری ھے. اس وقت کہیں کہیں جو سودیشی کی ہمت
افزائی کرنیوالے لوگ تھے وہ کارگاہ ھی پر زور دیا کرتے تھے.

جب سے چرخے کا کام شروع کیا گیا اس وقت سے کام
کرنیوالوں کی یہ کوشش رھی کہ جتنا اچھا اور باریک کپڑا بنا
جا سکے، بنا جائے. یہ بھی طے کیا گیا کہ جہاں پیداوار کے
مرکز کھولے جائیں وہاں اس بات کی کوشش کی جائے کہ کم
خرچ میں اعلی سے اعلی کپڑے تیار کئے جائیں. مگر اس میں
دقت یہ تھی کہ وھاں چرخے تو چلتے تھے لیکن روئی کی کمی
تھی اسلئے ویسی روئی وھاں دور سے لائی جا کر سوت کاتنے
والیوں کو دی جاتی تھی. کہیں کہیں وہ روئی وھیں خرید لی
جاتی اور سوت کے دام دیکر بیچی جاتی تھی. اور کسی
کسی جگہ سوت اور روئی کا باھم تبادلہ ہوتا، جسمیں سوت
کے ڈیڑھ گنے یا پونے دو گنے کے حساب سے سوت کی باریکی

پر روئی دی جاتی. جو روئی زیادہ ہوتی وہ انکو مزدوری میں دے دی جاتی. میں کئی مرکز پیداوار پر جا کر دیکھا کرتا اور خود روئی تولا کرتا. غریب کاتنے والیوں کی بھیڑ لگی رہتی اور وہ دور دور سے آکر سوت بیچ جایا کرتیں. اس سے جو چند پیسے مل جاتے وہی ان کا سہارا ہوتا. اگر کھادی بھنڈار ان کا سوت نہ خریدتا تو کوئی دوسرے خرید لیتے تھے. کہیں کہیں زیادہ کارگاہ چلا کرتے تھے، لوگ مل اور چرخہ کے سوت کو ملا کر کپڑے بنا کرتے تھے، اسی جگہ کچھ سوت بك جایا کرتا. یہاں بھی جب چرخہ سنگھ نے کام شروع کیا تو کاتنے والیوں کا کام بہت بڑھگیا، سوت زیادہ تیار ہونے اور بکنے لگا. ابھی یہ خیال نہیں تھا کہ سوت کاتنے کیلئے جو مزدوری دی جاتی ہے اس سے کاتنے والیوں کو کیا بچتا ہے اور انکی محنت کا پورا معاوضہ ہوتا ہے یا نہیں. یہ سب سمجھتے تھے کہ اگر ان کو یہ بھی نہ دیں تو ان بیچاریوں کی یہ آمدنی بھی بند ہو جائے. ہم جو یہ دیتے رہے تو ان کیلئے ہماری یہ بڑی مہربانی ہے. یہ بھی سوچنا پڑتا تھا کہ ہم جو کھادی تیار کرتے ہیں وہ سب نکل بھی

جائے. اتنی کم مزدوری دینے پر جو کھادی بنی جاتی تھی اسکی قیمت مل کے کپڑے سے بہت زیادہ ہوتی، اور کھادی بیچنے کا ایک بہت بڑا سوال ہمارے سامنے رہتا. ایک طرف تو ہم کھادی کو اچھا اور زیبائشی بنا کر لوگوں کو لبھاتے تھے، دوسری طرف ہماری کوشش یہ تھی کہ ہم اسکو مل کے کپڑے کی قیمت میں لے آئیں. کام تو کٹھن تھا لیکن اسمیں کامیابی بہت حد تک ہو گئی. کیونکہ کاتنے والیوں کی جیسی ترقی ہوتی گئی ہم بڑھیا کھادی تیار کرتے اور قیمت بھی گھٹاتے گئے. موٹی کھادی کی قیمت تو تقریباً مل کے برابر ہو گئی تھی لیکن باریک کھادی کی قیمت میں ابھی بہت فرق تھا.

میں دیکھتا تھا کہ ایسے کاموں سے بہت سے غریبوں کی کچھ نہ کچھ روزی چلنے لگی، اگرچہ وہ تھوڑی ہی تھی. کیونکہ کھادی پرچار اور اسکے پھیلاوے کو ہم بے انتہا ضروری سمجھتے تھے. اسوقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ہم بکری بڑھانے کا انتظام کرسکیں تو ہم جتنی چاہیں کھادی پیدا کرسکتے ہیں. لیکن ہاں، باریک کھادی کی پیداوار کم ہو گئی، کیونکہ باریک سوت کاتنے والیاں کم تھیں اور ان کو عادت بھی زیادہ

نہیں تھی. پھر ہمیں تو لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ اگرچہ ایک گز کھادی میں زیادہ پیسے لگانا پڑتے ھیں پھر بھی کئی حیثیت سے کھادی سستی تھی. ہمارا دعوی تھا کہ کھادی زیادہ مضبوط ھوتی ھے اور یہ دعوی علمی طریقہ سے ثابت کیا جا سکتا ھے. جن میں ایک تو یہ تھا کہ جہاں صرف روئی پیدا ھوتی تھی، اگر وھیں سے اسکا کپڑا بنا جائے تو کھیت سے روئی نکالنے کے تھوڑے ھی دنوں کے اندر تیار ھو سکتا ھے. لیکن اس کے بر خلاف جو کپڑا مل میں تیار ھوتا ھے اسکی روئی کم سے کم ڈیڑھ سال پہلے کھیت سے نکالی جاتی ھے. وقت کا اثر مضبوطی پر ضرور پڑتا ھے. یہ وقت ایک دوسرے طریقہ سے کھادی میں اور بھی کم لگتا تھا، کیونکہ تیار ھونے پر کپڑا جہاں بنا جاتا تھا وھیں آس پاس جلد سے جلد بک جاتا تھا. اور مل کا کپڑا تیار ھونے کے بعد بھی کارخانے کے اندر سے دوکانوں میں جا کر پڑا رہ جاتا. زیادہ مضبوطی کیلئے دوسرا سبب بھی تھا. جہاں روئی پیدا ھوتی تھی وھاں کھیت سے نکالی جا کر گھر میں صاف کی اور دھنی جاتی، جس سے اس کا سوت تیار ھو سکتا تھا.

اسطرح اسکی صفائی و دھنائی میں و نیز اسکے ریشونمیں اتنا زور اور اتنی کھینچ نہیں پڑتی تھی جتنی کہ مل میں پڑتی تھی. اسمیں شك نہیں کہ مل کی صفائی میں بھی روئی زیادہ کھنچتی ہے. پھر صاف کئے جانیکے بعد وہ گانٹھوں میں اتنی کس کر باندھی جاتی ہے کہ وہ اینٹ کی طرح ہو جاتی ہے، پھر دھننے کے وقت اسکو علحدہ کرنا پڑتا ہے. اس طریقہ سے اس کے ریشے بہت کمزور ہو جاتے ہیں. کھادی میں مقامی روئی ان کاموں سے بچ جاتی ہے، اس لئے اس کے ریشہ کی طاقت بنی رہتی ہے. پھر بنائی کا طریقہ بھی مل کا ایسا ہوتا ہے کہ جس میں ریشے پر کافی زور پڑتا ہے، ریشے کئی بار کھینچ تان کر درست کئے جاتے ہیں. مل کا کتا ہوا سوت اچھا تو ضرور ہوتا ہے، کیونکہ اس کے سب ریشے سیدھے کر دئے جاتے ہیں، لیکن اس میں شك نہیں کہ ایسا کرنے میں اسکی بری گت ہو جاتی ہے. یہی سبب ہے کہ جس روئی سے مل میں بیس نمبر کا سوت تیار ہوتا ہے اسی روئی سے چرخہ پر آسانی کیساتھ چالیس پچاس نمبر تك کا سوت تیار ہو سکتا ہے. سوت کی کتائی میں بھی مل میں ریشوں کو زیادہ کھینچ تان برداشت

کرنی پڑتی ھے. ان سب وجھوں سے مل کا سوت طاقت میں ھاتھ کے سوت کا مقابلہ نہیں کر سکتا. لیکن اسکے لئے شرط یہ ھے کہ جتنے قسم کی ترکیبیں ھوتی ھیں وہ ٹھیک طرح کی جائیں. مثلاً ٹھیک طرح سے صفائی کتائی نہیں ھوتی تو سوت اچھا نہیں ھو سکتا، اور جب سوت اچھا نہیں کتے گا، تو اسمیں جتنی ناپ میں بل دینا چاھئیں اتنے میں نہیں دئے گئے، تو سوت بھی کمزور ھوگا.

مل کے اور ھاتھ کے کام میں ایک بہت بڑا فرق یہ ھے کہ مل میں ایک قسم کی دھنائی اور کتائی کرنی پڑتی ھے. دھنائی اور کتائی پر اگر کنجی لگتی گئی تو ٹھیک ویسی ھی بنائی اور کتائی بھی ھوگی، اسمیں بہت فرق نہیں پڑے گا. اگر پرزے میں کہیں کوئی عیب ھو تو وہ پرزہ ھمیشہ اپنا عیب سوت میں دکھاتا جائیگا. پرزے میں اگر کوئی عیب ھے تو ھر دو گز پر اسکا عیب سوت کے دیکھنے میں آئیگا. یا سوت ایسے مقام پر پھونچے گا تو پرزے کا اثر اسپر ضرور پڑے گا. اسلئے مشین کے کام میں ایک طرحکی برابری ھوتی ھے، چاھے وہ بٹائی میں ھو یا سوت میں. ھاتھ کے کام میں یہ بات نہیں

ہوتی. کیونکہ ایک تو آدمی مشین کی طرح کام نہیں کر سکتا، دوسرے اسکی طاقت، توجہ، اور بہت سی دوسری باتوں کا اثر اسکے کام پر پڑتا ہی جاتا ہے. اسلئے ہاتھ کے کام کرنیوالے کی اپنی محنت خاص شکل سے ظاہر ہوتی رہتی ہے. جب تک کاتنے والا پورا ماہر نہیں ہو جاتا سوت برابر نہیں ہوتا اور نہ اسمیں یکساں طاقت ہوتی ہے. مگر مشین کے سوت میں ایک خاص جگہ پر ایک خاص کمزوری آئیگی. وہ فوراً دیکھنے میں نہیں آتی، کیونکہ اسکی کمزوری اگر ہوتی ہے تو قاعدہ کی رو سے اتنی دور پر نہیں ہوتی جتنی مل میں.

اگر کھادی کا ٹھیک انتظام کیا جائے جیسا کہ ہونا چاہئے، تو اسمیں شک نہیں کہ وہ بعد میں مل کے مقابلہ میں کم خرچ میں تیار کرائی جا سکتی ہے. کھادی کیلئے صحیح اصول تو یہ ہے کہ جہاں کسان اپنے کھیت میں کپاس پیدا کرے وہیں وہ صاف کی اور دھنی جائے، اور اسکا سوت گھر ہی میں تیار کر لیا جائے اور پھر اسی سوت کا اسی گاؤں میں کپڑا بنا جائے. اس طرح تیار کی ہوئی کھادی گھر کے لوگ استعمال کریں. اس سے ایک تو جلد سے جلد روئی کا کپڑا تیار ہو سکتا ہے،

اسلئے زیادہ وقت گزر جانیکی وجہ سے جو کمزوری پیدا ہو جاتی ہے وہ ایک حد تک دور کی جا سکتی ہے. دوسرے، کارخانے کی یہ حالت ہے کہ کپاس گاؤںمیں پیدا کی جاتی ہے، پھر لادکر کچھ دور کے کسی شہر میں لائی جاتی ہے اور وہاں دھنائی کے کارخانے میں پہونچائی جاتی ہے. وہاں سے صاف ہوکر وہ گانٹھونمیں مضبوط باندھی جاتی ہے. وہ گانٹھیں بھی وہاں بھیجی جاتی ہیں جہاں گرنیاں یعنی کارخانے ہوتے ہیں. ہندوستان میں سیکڑوں میل کی دوری سے روئی لاکر گرنیونمیں سوت کاتا جاتا ہے. زیادہ‌تر تو باہر کے ملکوں سے بھی روئی لانی پڑتی ہے. دوسرے ملکوں جیسے انگلستان میں تو ساری روئی دوسرے ہی ملکوں سے منگانی پڑتی ہے، کیونکہ وہاں روئی نہیں ہوتی. لیکن جو کپڑا اس سے تیار ہوتا ہے وہ دنیا کے سب ملکونمیں جہاں اسکی کھپت ہوتی ہے اور جس کارخانے سے اس کا تعلق ہوتا ہے، پہونچایا جاتا ہے. اس ملک کے گاؤں گاؤں تک میں وہ کپڑا بیچا جاتا ہے. اس طرح کھیت سے صفائی کے کارخانے تک اور اس کارخانے سے دھنائی کے کارخانے تک اور اس کارخانے سے گرنی (کارخانے) اور

گرنی سے خریدار تک کپاس، روئی اور کپڑا ڈھونے میں جتنا خرچ ہوتا ہے وہ کھادی میں یکبارگی بچ جاتا ہے. یہ کوئی چھوٹی رقم نہیں ہوتی، کپڑے کی قیمت کا ایک بڑا جز ڈھلائی کا خرچ ہوتا ہے. اس کے علاوہ بھی ہر موقع پر بیوپاری اپنا منافع رکھتے ہیں، جو کپڑے کی قیمت میں جوڑا جاتا ہے. اوپر بتایا گیا ہے کہ مل کے کپڑے کے مقابلہ میں کھادی زیادہ مضبوط بنائی جا سکتی ہے. یہ سب باتیں اگر دھیان میں رکھی جائیں اور گاؤں کے لوگ وہاں کی روئی کو وہیں دھنیں، کاتیں اور بن کر کپڑا تیار کرلیں. اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ اگر کھادی میں کفایت نہیں ہوگی تو کم سے کم مل کے مقابلہ میں کم قیمت میں گاؤں والوں کو ضرور مل سکے گی. لیکن ہم سست ہو گئے ہیں اسلئے دام دیکر بنی بنائی چیز لینی زیادہ پسند کرتے ہیں، اسیوجہ سے کھادی مہنگی ہو گئی ہے.

مہاتماجی ان باتوں پر جیل میں بہت غور کرتے رہے. ساتھ ہی ان کے سامنے اس وقت یہ سوال تھا کہ ان سب کو جو مزدوری ملتی ہے کیا وہ اتنی کم ہوتی ہے کہ اس میں انکا گزارہ نہیں ہو سکتا؟ اور اگرچہ اس اصول کے اعتبار

سے "جہاں کچھ نہیں وہاں تھوڑا تو ہے" ان کو جو کچھ بھی مل جاتا تھا وہ ان کیلئے ایک طرح کی مہربانی ہے. پھر بھی کھادی پہننے والے کو یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ایسا کرے جس سے سوت کاتنے والیوں سے صرف اپنا کام ہی نکالے. اس لئے گاندھی جی نے وردھا میں کھادی کے متعلق ایک نیا اصول جاری کیا. وہ یہ کہ کاتنے والیوں کو اتنی مزدوری ضرور ملنی چاھئے جس سے وہ اپنا گزر کر سکیں.

جیسا اوپر کہا جا چکا ہے کہ کاتنے والیوں کی مزدوری بڑھا دینے سے کھادی کی قیمت بہت بڑھ جاتی تھی. کم مزدوری دیکر بھی کھادی کی بکری میں جتنی دقت تھی وہ زیادہ دام بڑھا دینے سے اور زیادہ ہو جاتی. ہم میں سے بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اس طرح جو کھادی کم ہونے لگی وہ اور کم ہوتی جائیگی، اور کھادی کی فروخت بھی گھٹ جائیگی. گاندھی جی اتنی دور تک کا سمجھوتہ کرنے کیلئے تیار تھے کہ اگر ہم اتنی مزدوری نہیں دے سکتے تھے کہ جو مزدوری اسوقت دیتے تھے اس سے کئی گنی مزدوری بڑھا دینی چاھئے. مزدوری کی در (شرح) اسطرح لگائی

جائے کہ جس سے آدھہ گھنٹہ کام کرکے اگر کوئی کاتنے والی اوسط درجہ کا سوت کات سکتی ہے اور اوسط پیداوار تین سو گز ہر گھنٹہ میں ہو جائے تو اس سے وہ تین آنہ مزدوری پا سکیگی. بہت چھان بین «اور شری ونوبابھاو» کے کچھ دنوں کے تجربے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ جس میں دوسرے کاریگروں کو سوت خریدنے میں آسانی ہو. اور وہ کاتنے والیوں کا پتہ لگا سکیں کہ انہیں ٹھیک مزدوری دی جا رہی ہے یا نہیں. اسکی ایک مکمل فہرست تیار کی جائے کہ یہ فلاں نمبر کا سوت ہے جس کیلئے فی لچھی کتنی مزدوری دی جائیگی. جیسا سوچا گیا تھا اسکے اعتبار سے کھادی کی قیمت بہت بڑھگئی. اسکے ساتھ ھی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کھادی کی بکری کم نہیں ہوئی. کیونکہ زیادہ تر جہاں پیداوار تھی وھاں کھادی بہت بکنے لگی اور ایک نیا طبقہ کھادی پہننے والوں کا پیدا ہو گیا. ابھی تک جو کاتنے والی سوت کاتی تھی یا جو بننے والا اسے بنتا تھا وہ اپنے ھاتھ کے کتے ہوئے سوت سے، اپنے ھاتھ کا بنا ہوا کپڑا بہت کم پہنا کرتے تھے. کھادی بننے والے خود کھادی نہیں پہنتے تھے، دوسرے ھی

لوگ اسے استعمال کرتے تھے. اب یہ فیصلہ کیا گیا کہ سوت کاتنے والے اور بننے والے بھی کھادی پہنا کریں. زیادہ مزدوری کی یہ بھی ایک شرط تھی کہ اسمیں سے ایک حصہ کاٹ لیا جائیگا، جسکے عوض میں اسے پہننے کیلئے کھادی دی جائیگی جو اسے خود پہننی بھی پڑے گی. اسطرح مزدوری کا ایک حصہ ہر ہفتہ یا پندرہ روز میں کاٹ کر کاتنے والیوں کے نام پر جمع رکھا جاتا. اور جب انہیں ضرورت ہوتی تھی کپڑا دے دیا جاتا تھا. اسطرح سے ان کو ایک دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ سب کاتنے والیوں کے نام پر علحدہ حساب رکھا جانے لگا اور اس کے ذریعہ سے ہر ایک کاتنے والی کے ساتھ چرخہ سنگھ کا حقیقی تعلق ہو گیا. مزدوری لگانے کے وقت اسکی سوت کی ہر لچھی کی جانچ بھی ہوتی. اور سوت کی لچھی کے حساب سے مزدوری ملنے کی وجہ سے سوت سدھار میں کافی مدد ملی. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کو جو کھادی ملتی وہ پہلی کے مقابلہ میں بہتر ہوتی. اگرچہ لوگوں کو دام زیادہ دینے پڑتے لیکن پھر بھی اتنی تکلیف نہیں اٹھانا پڑتی. کھادی کی مانگ کافی بڑھتی گئی. جو اندیشہ تھا کہ

بلا وجه دقت بڑھ جائیگی وہ بڑی حد تک بے بنیاد ثابت ہوا. مانگ بڑھنے کے اور اسباب بھی ہو سکتے ہیں یعنی لوگوںمیں زیادہ بیداری وغیرہ. لیکن اس میں شک نہیں کہ اس اصول سے کھادی کی ترقی ہوئی.

اسکا ایک دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ نقلی کھادی بہت بکنے لگی. چرخہ سنگھ خود اپنے مرکزوں کی کھادی تیار کرایا کرتا اور اپنی دوکانوںمیں جو جگہ جگہ تھیں ان کو بیچا کرتا تھا. اسکے علاوہ بہت سے بیوپاریوں کو جو شدھ کھادی بنواتے تھے، صداقت نامہ بھی دیا جاتا. ان کی تیار کی ہوئی کھادی بھی ویسی ہی شدھ سمجھی جاتی تھی جیسی چرخہ سنگھ کی. اس طرح اپنی اور چرخہ سنگھ کی کھادی میں ایسی اصلی کھادی پیدا کرنے والوں سے سستی سے اور اچھی سے اچھی کھادی تیار کرنے کا ایک قسم سے مقابلہ سا رہتا تھا. اب جو چرخہ سنگھ نے مزدوری بڑھا دی تھی، اس سے ایسی کھادی پیدا کرنے والے بھی، جو پرانی ہی مزدوری کے اعتبار سے سوت خریدتے تھے، بہت نفع کمانے لگے. اسلئے اصلی کھادی وہی سمجھی جانے لگی جو نئے اصول کے مطابق کافی

مزدوری دیکر تیار کرائی جاتی. بہت سے کھادی بننے والوں نے نیا طریقہ مان لیا. چرخہ سنگھ نے زیادہ مزدوری کی شرط منوا کر اور اسکی دیکھ بھال کا انتظام کر کے ان کو صداقت نامہ دے دیا. لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے صداقت نامہ نہیں لیا. وہ پرانے ہی ڈھنگ پر مزدوری کی پرانی ہی شرح پر کام کراتے رہے. بہت سے کانگریسی لوگوں نے بھی، جنھوں نے نئے طریقہ کو پسند نہیں کیا، ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کی. اس سے بازار میں کھلے میدان اصلی کھادی بکنے لگی. نقلی کھادی تیار کرنے اور بیچنے والے کافی نفع کمانے لگے. کیونکہ ان کی کھادی کم خرچ سے تیار ہوئی اور اسے وہ کافی نفع کیساتھ اصلی کھادی کے مقابلہ میں سستے داموں میں بیچ سکتے تھے. جتنا فرق مزدوری میں تھا اسکے مقابلہ میں کھادی کی بکری کے درمیان کم فرق تھا. وہ منافع پورے روپے میں نقلی کھادی بیچنے والے کو مل جاتا تھا. اس طرح نقلی کھادی بہت بکنے لگی. چرخہ سنگھ سارا سوت نہیں خرید سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس اسکے لئے کافی سرمایہ نہیں تھا. اسلئے کم مزدوری دیکر بھی دوسروں کو کافی

سوت مل جاتا. چرخه سنگھ نے اسکی روك تھام کرنے کی تدبیر کی، کانگریس کارکنوں نے بھی کانگریسیوں کو ھدایت دی که وہ اصلی کھادی ھی استعمال لائیں، اور نقلی کو کھادی ھی نه سمجھیں. بہت سے لوگوں نے اس بات کو نه مانا، اسلئے نقلی کھادی خوب چلتی رھی.

جیسا که اوپر کہا جا چکا ھے که نئے طریق سے کھادی میں اصلاح بہت ھوئی. چرخه سنگھ سوت وغیرہ میں جتنا سدھار کرنا چاھتا تھا وہ اس نے کیا. وہ گاوؤںمیں کھادی زیادہ چلانے لگا. اس کا دوسرا سبب یه بھی ھوا که مہاتما جی نے فیصله کیا که جہانتك ھو سکے یه کیا جائے که جہاں کھادی پیدا کی جائے، وھیں اسکی کھپت ھونی چاھئے. کچھ دنوں بعد ایك صوبه سے دوسرے صوبه میں کھادی کا آنا جانا بند کر دیا گیا. صرف خاص قسم کی کھادی کے باھر بھیجنے کی اجازت ملتی، لیکن معمولی طور سے کھادی صوبه کے باھر نہیں بھیجی جا سکتی. اوپر بتایا جا چکا ھے که کپڑے کو ایك مقام سے دوسرے مقام پر ڈھو کر لیجانے سے کافی خرچ پڑتا ھے، اس لئے یه تدبیر کی گئی که کھادی میں وہ خرچ نه پڑے.

کھادی کے اصول میں بڑی تبدیلی ہو گئی. پیدا وار اور فروخت پر جتنا زور دیا جانا چاھئے تھا، آھستہ آھستہ اب دیا جانے لگا. اس طرح سے کھادی پہلے کے مقابلہ میں اب زیادہ بکتی. لیکن اب اپنے اوپر بھروسہ کرنے کا زیادہ دھیان دیا جانے لگا. جس کا مطلب یہ ھے کے شخص اور سماج دونوں اپنے لئے کھادی کو اپنے ھی مقام پر تیار کرائیں اور استعمال کریں. یہ اصول کوئی نیا نہیں تھا، کیونکہ پہلے بھی بہت سی جگہوں پر اس کا استعمال ھوا، اسمیں کسی کسی جگہ کامیابی ھوئی تھی. خود اعتمادی کے خیال سے بعض جگہوں پر جنتا کیلئے وھیں کافی کھادی تیار کی جاتی. جس سے وھاں کے لوگوں کو نہ باھر سے کپڑا منگانا پڑتا اور نہ وھاں کی اپنی کھادی باھر بھیجنی پڑتی. یہ استعمالی تجربہ بہت مظاھرے میں نہیں کیا گیا تھا لیکن بہر حال کامیاب ضرور ھو گیا. اگرچہ اسکا نتیجہ مستقل نہیں نکلا، لیکن پھر بھی جب تك اپنے مقام پر کارکن کام کرتے رھے اور لوگوں کا حوصلہ و جوش بڑھاتے رھے، اس وقت تك کام ھوتا رہا. ان کے ھٹ جانے کے بعد لوگوں نے اپنی کھادی تیار کرنی

بھی چھوڑ دی ، اسلئے باہر سے پھر کپڑا وہاں جانے لگا. مہاتماجی نے سوچا کہ جب تک لوگوںمیں کھادی کے بارے میں اتنا جوش و پریم نہیں پیدا ہوگا کہ وہ اسے کبھی چھوڑنے پر تیار نہ ہونگے ، اس وقت تک یہ کام پھیل نہیں سکتا ، جتنا کہ وہ چاھتے تھے . اس کے لئے کھادی کے متعلق علم اور کھادی بننے کے سامان دونوں کی ضرورت تھی . چرخہ سنگھ نے اب اس پر زیادہ سے زیادہ دھیان دیا . اسے اتنی ھدایت ملی کہ جہاں وہ کام کرے وہاں لوگوں کو کھادی کی تعلیم بھی دے اور کھادی کے متعلق جو مشینیں ہوتی ھیں اسکی درستی بھی کرائے . ساتھ ھی ساتھ ایسی مشینوں سے کام لیا جاتا جس سے لوگ مضبوط اور اچھی کھادی بننا سیکھ لیں .

تجربہ کے بعد دو باتیں خاص اہم نکلیں . ایک یہ کہ روئی صاف کرنے سے اسمیں کچھ کمزوری ہو جاتی ھے ، اسلئے بنولے نکال دینے کا ایک ایسا طریقہ نکالا گیا جو پہلے سے کہیں جاری تھا لیکن سب جگہونمیں نہیں . اسکے لئے مشینوں کی ضرورت نہیں ہوئی ، صرف چھوٹی سی ایک پٹری اور لوھے یا لکڑی کی ایک ، چھوٹی سی انگلی کے برابر ، موٹی سلاخ کافی

تھی. دھنائی سے ریشوں میں کمزوری آتی ھی ھے، اسلئے
دھنائی کے بجائے ھاتھ سے اسکو تنا جانے پر زیادہ زور دیا
گیا. ان ترکیبوں سے ریشے کی طاقت کم سے کم بکھرتی ھے.
اس کا نتیجہ کپڑے پر ضرور اثر انداز ھوتا تھا. تا کہ کپڑا
زیادہ مضبوط نکلے. کھادی کی بنائی کا بھی سوال سخت تھا.
سب کچھ ھو جانے کے بعد بھی ھاتھ کے کتے ھوئے سوت
میں اتنی مضبوطی اور برابری نہیں ھوتی تھی، جتنی مل کے
سوت میں. اسلئے بننے والے اتنی تیزی کے ساتھ ھاتھ سے کتے
ھوئے سوت کا کپڑا نہیں بن سکتے، جتنا کہ مل کے کتے ھوئے
سوت سے. اس کا نتیجہ یہ ھوتا تھا کہ کھادی بننے کیلئے وہ
زیادہ مزدوری لیتے تھے. کھادی کے دام اس سبب سے بھی
زیادہ ھوتے تھے. مہاتماجی نے سوچا کہ سوت میں بھی
اصلاح ھونی چاھئے، جس سے بننے والوں کو آسانی ھو. تنائی
وغیرہ سے کچھ اصلاح تو ھوئی لیکن دو سوتوں کو ایک ساتھ
بٹکر بنائی کے قابل بنانے کا طریقہ بہت مفید ثابت ھوا. اس
پر بھی زور دیا جانے لگا کہ ایک ساتھ بٹکر دو سوت دیا
جایا کرے. لیکن یہ رواج نہ چلا کیونکہ ایک تو اسمیں ایک

عجیب ترکیب کام میں لائی جاتی، دوسرے فی گز کپڑے کیلئے زیادہ سوت بھی لگانا پڑتا. لیکن اسمیں شک نہیں کہ کپڑے کی مضبوطی میں کافی فرق ہو جاتا. اس طرح کی ترکیب میں سدھار کی کوشش برابر ہوتی رہی ہے. لیکن ادھر اب زیادہ زور پیداوار کے بڑھانے میں رہا. اسلئے لڑائی کے دنوں میں اور اسکے بعد بھی، جب ملك میں کپڑے کی بہت کمی رہی، اور جب اسکا موقع بھی تھا کہ کھادی کی پیداوار اور بکری زیادہ بڑھائی جا سکتی تھی، اس وقت وہ نہیں بڑھی. اور اسوقت جو ایك بہت بڑی کمی تھی وہ بھی پوری نہیں کی جا سکی. خود مکتفی کرنے کا کام تو بہت کٹھن ہے. اسلئے کھادی کا چلن دیکھنے میں نہیں آتا. اور اسلئے بہت سے لوگوں کی عقل میں کھادی کا اصول وقت کے موافق نہیں رہا ہے. اسکا جتنا چلن ہو سکتا تھا، لوگوں کو اس سے جتنا فائدہ پہونچایا جا سکتا تھا، کپڑے کی کمی جس حد تك دور کی جا سکتی تھی، ان باتوں میں سے ایك بات بھی پوری نہیں ہوئی. کچھ لوگ یہ مانتے تھے کہ چرخہ سنگھ کے اس اصول سے ہی کھادی کو بہت نقصان پہونچا. لڑائی کے زمانے میں اور

اسکے بعد بھی، ملک کی ملیں لڑائی کے سامان تیار کرنے میں لگی ہوئی تھیں. اسلئے عوام کے استعمال کیلئے معمولی کپڑا نہیں بنتا تھا یا کم بنتا تھا. غیر ملکی کپڑا آنا بند ہو گیا تھا. اس سے ملک میں کپڑے کی بڑی کمی ہو گئی. اسوقت جتنی کھادی بن سکتی ملک اسے خرید لیتا. وھی موقع تھا جبکہ کھادی کی پیدارار بہت بڑھائی جا سکتی تھی. کپڑے کے دام اتنے بڑھ گئے تھے کہ مل کے کپڑے کے مقابلہ میں چرخہ سنگھ کی کھادی سستی ملتی. جو کبھی کھادی نہیں پہن سکتا تھا وہ بھی کفایت کی وجہ سے کھادی لینی چاھتا تھا. لیکن اسکو کھادی نہیں ملتی تھی. کہیں کہیں چرخہ سنگھ کو بھی یہ سوچنا اور کرنا پڑا کہ اس کے جو پرانے خریدار تھے، یعنی جو عادتاً کھادی استعمال کرنے والے تھے. انکے ھی ھاتھوں کھادی بیچی جائے. یہ افسوس کی بات کہ اس موقع پر کھادی کی پیداوار بڑھانے کا فائدہ نہ اٹھایا گیا اور کپڑے کی کمی کیوجہ سے غیر ملکوں سے کپڑا لانیکی پالیسی گورنمنٹ کو اختیار کرنی پڑی.

سوراج کی ساری لڑائی کے زمانہ میں بدیشی کپڑے کا

بائیکاٹ ہماری تحریک کا ایک خاص اور بہت بڑا جز رہا ھے اسکے متعلق بہت سے نیتاؤں کے ساتھ مہاتماجی کا اصولی اختلاف رہا کرتا تھا. کچھ لوگ تو صرف بدیشی کپڑے ھی کا بائیکاٹ نہیں چاھتے تھے بلکہ ان کا اصول تو یہ تھا کہ سبھی برٹش چیزوں کا بائیکاٹ کرنا چاھئے، کیونکہ ہماری لڑائی برٹش کے ساتھ تھی. اور چونکہ برٹش اپنی تجارت پر ھی بہت کچھ بھروسہ رکھتی ھے، اور اسکا مال ھندوستان میں بہت کھپتا ھے، اسلئے اسکے مال کا بائیکاٹ کر کے ھم اسپر دباؤ ڈال سکتے ھیں. اس سے ھم سوراج کے متعلق اپنی مانگ منوا سکیں گے. گاندھی جی اس قسم کے بائیکاٹ کی پالیسی میں ھنسا کی کچھ جھلک دیکھتے تھے، اس لئے وہ سبھی برٹش مالوں کا بائیکاٹ پسند نہیں کرتے تھے. کپڑے کے متعلق انکا خیال تھا کہ انگریزوں نے اپنے سیاسی اقتدار کا غلط استعمال کر کے ھندوستان کے کپڑے کی مقامی تجارت کو نیست و نابود کیا ھے. اسلئے ایسی کوششوں کو دوبارہ زندہ کرنا چاھئے. کیونکہ یہ ایک قسم سے وسیع اور عام کوشش تھی. اسکے فنا ھو جانے سے گاؤونکی کی زندگی میں بڑی تبدیلی پیدا ھو گئی تھی.

وہ مانتے تھے کہ اس کے دوبارہ زندہ کرنے میں صرف برطانوی کپڑے کے بائیکاٹ ھی سے کام نہیں چلے گا، بلکہ اس کیلئے سبھی ملکوں سے کپڑے کا آنا بند کرنا ضروری ھے. اس لئے وہ سبھی بدیشی کپڑوں کے بائیکاٹ پر مخصوص زور دیا کرتے تھے، صرف برٹش کپڑے ھی کے بائیکاٹ پر نہیں.

ادھر کچھ برسوں سے پچھلی لڑائی سے پہلے جاپان سے بھی بہت کپڑا آنے لگا تھا. ایك طرح سے جاپانی کپڑا اپنا اثر جماتا جا رھا تھا. مہاتما جی مانتے تھے کہ برطانوی کپڑے کو ھٹا کر جاپانی کپڑا کام میں لانا ملك کیلئے مفید نہیں ھوگا. لیکن حب وطن پر قائم رھنا ھر طریقه سے برطانوی کپڑے کے بائیکاٹ سے ھوگا. ادھر تو ملك کی ملوںمیں کافی کپڑا تیار ھو گیا ھے، غیر ملکوں سے بھی کچھ آنے لگا. پھر اگرچه کپڑے اور اسکی قیمت پر قابو ھے اور اسکی قیمت بھی بہت بڑھی ھوئی ھے. پھر بھی کھادی کو جتنی چاھئے اتنی مدد نہیں مل رھی ھے. پھر کیا ھوگا، یه آئندہ کے حالات پر موقوف ھے.

مہاتماجی نے کھادی کو صرف ایك گھریلو دھندے کی ھی

شکل میں نہیں دیکھا تھا. اگرچہ یہ ایك ایسی کوشش ہو جاتی
جس سے جنتا کے سب سے غریب طبقہ کو مدد ملتی، انہوں
نے اسکو بار بار سب کوششوں کا مرکز قرار دیا. کئی جگہوں پر
ایسا لکھا بھی ھے کہ جیسے سیاروں میں سب سے بڑا سورج
ہوتا ھے ویسے ھی سب دیہاتی پیشوں میں کھادی کا بڑا مقام
ھے. سوراج تحریك کے زمانے میں کھادی پہننا ھماری تحریك
کا ایك نشان بن گیا تھا. اگر مہاتماجی کا قابو چلتا اور سبلوگ
ان کی بات مانتے تو چرخہ چلانا ھر ایك کارکن اور نیتا کیلئے
لازم ہو جاتا، اور کھادی صرف جسم ھی پر نہ ہوتی بلکہ دل
کے اندر بھی گھر کر لیتی. لیکن یہ پوری طرح نہ ھو سکا.
کانگریس نے اسے صرف ایك وردی ھی تسلیم کیا اور وہ
جسم ھی پر رہ گئی، اندر داخل نہ ھو سکی. اگر وہ اندر
داخل ھو جاتی تو ھماری زندگی میں زبردست تبدیلی واقع
ھو جاتی. جہاں بڑے بڑے مشینوں کے کارخانے روز بروز
کھلتے جا رہے ھیں اور چھوٹی چیزوں کے تیار کرنے کا کام
اپنے ھاتھوںمیں لیتے جا رہے ھیں، اور جہاں جنتا میں بیکاری
روز بروز بڑھتی جا رہی ھے، وھیں کھادی یہ ثابت کرتی کہ

انسانوں کو سکھی بنانے اور سچی خوشی پہونچانے کیلئے ظاہری دکھاوے کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی سادہ زندگی اور اندرونی اطمینان کی. کھادی جسمانی محنت کی عزت اور پابندی کو بڑھاتی ہے. مہاتماجی اپنے اکیس دن کے روزے میں بھی جب ان کی جسمانی طاقت بہت گرنے لگتی تھی، تو بھی ایک دن کیلئے بھی چرخہ چلانا بند نہیں کرتے تھے. جب پبلک کام میں اتنی زیادتی ہوتی تھی کہ ان کو چرخہ چلانے کا وقت ملنا مشکل ہو جاتا تھا. اس وقت بھی وہ آرام اور سونے کے وقت کو گھٹا کر چرخہ چلانے کا وقت نکال لیا کرتے تھے. وہ چرخہ چلانے کو ایثار سمجھتے تھے، اور جس مذہبی جذبہ سے وہ چرخہ چلایا کرتے تھے اسی جذبہ سے وہ پرارتھنا (عبادت) بھی کیا کرتے تھے. ان کیلئے چرخہ ہی مصیبت دور کرنے والا سرمایہ تھا. اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیتے تو ہماری زندگی میں سادگی آ جاتی، ہم کبھی غریبوں کی روزی چھین کر بڑے بڑے کارخانوں کے لالچ میں نہ پڑتے اور جسمانی محنت کی عزت کرنے لگتے. پھر تو ساری زندگی کا رخ ہی بدل جاتا. باہری چمک دمک

اور ظاہری دکھاوے کو بڑھا کر زندگی کے معیار کو اونچا کرنے کا جو خیال پھیل رہا ھے اسکو بھی ہم ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتے. اس وقت ہم پورے اطمینان سے سچی خوشی کا تجربہ کرنے لگتے. لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا اور نہ سمجھا، ہم نے تو کھادی کو صرف ایک وردی ھی سمجھا جو بدلی جا سکتی ھے، وہ کسی روحانی طاقت سے تعلق نہیں رکھتی. ہم نے کھادی کی روحانی طاقت ھی کو نہیں کھویا بلکہ مالی حیثیت سے بھی ہم اتنی ترقی نہ کر پائے جتنی کہ کرنی چاہئے تھی.